ثقافتِ ہزارہ
اور
اِس کا تہذیبی پس منظر

محمد بشیر رانجھا



اشاعت زیرِاہتمام

ہزارہ چیئر...... ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

ضابطہ

نام کتاب ...... ثقافتِ ہزارہ اور اس کا تہذیبی پس منظر

مصنف ...... محمد بشیر رانجھا

ضخامت ...... ۱۸۲ صفحات

تاریخِ اشاعت ...... اکتوبر ۲۰۱۲ء

قیمت تین سو روپے

رابطہ مصنف

Mob#: 0300-5119565
email: bashirranjha18@yahoo.com

اشاعت زیرِ اہتمام

ہزارہ چیئر ...... ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

انتساب

اپنے مرحوم و مغفور والدِ گرامی
جناب سلطان احمد رانجھا کے نام

☆☆☆

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

☆☆☆

فہرست

صفحہ نمبر

ثقافتِ ہزارہ اوراس کاتہذیبی پس منظر-میری نظر میں

ہزارہ کی ثقافت کے حوالے سے منظرِ عام پر آنے والی یہ پہلی تصنیف ہے جسے ہم بڑے فخر کے ساتھ اَدبی دُنیا میں متعارف کرا رہے ہیں ۔یوں تو ہزارہ کے اہلِ قلم نے بے شمار موضوعات پر مضامین اور کتب تصنیف و تالیف کی ہیں مگر میں ایک عرصہ سے ثقافتِ ہزارہ کے حوالے سے کسی جامع کتاب کا منتظر تھا جو ہزارہ کی تہذیب و ثقافت اور اس کے تاریخی اور تہذیبی تناظر میں لکھی جاتی۔ چنانچہ یہ تفاخر ''ہزارہ چیئر'' کو حاصل ہوا، جس کے زیرِ اہتمام دیگر کئی موضوعات پر کتب اشاعت پذیر ہوئیں اور آج اس کی جانب سے ایک نہایت اہم موضوع پر نہایت قابلِ قدر تصنیف منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

جناب محمد بشیر رانجھا ایک کہنہ مشق ادیب، شاعر اور محقق ہیں جن کی نصف درجن کتب اب تک ادبی حلقوں سے دادِ تحسین پا چکی ہیں ۔فاضل مصنف نے ہزارہ کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ نہایت محنت اور عرق ریزی سے پیش کیا ہے ۔موصوف نے تاریخی حقائق اور شواہد و براہین کے ساتھ ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کی اساس کو اُجاگر کیا ہے ۔نیز دیگر اقوام کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اثرات کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے عربی تہذیب و ثقافت کے مسلمانوں پر اثرات اور ان کے حوالے سے مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی اقدار اور ثقافت کے ہمہ رنگ پہلوؤں کو اُجاگر

کرنے میں تحقیق اور کمال مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مصنف نے عمیق مطالعے کے بعد عربی زبان کے حوالے سے اسلامی فکر، اسلامی اقدار اور تہذیب نفس سے مسلمانوں کو غیر مسلموں اور اسلام دشمنوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت کا امین اور پاسدار ٹھہرانے میں منفرد و ممتاز قرار دیا ہے۔

عرصۂ حیات میں مسلمان اقوام و ملل کی تہذیب و ثقافت سے بلا مبالغہ متاثر رہے اور یہ سلسلہ عصرِ حاضر میں کئی عوامل کے توسط سے جاری بھی ہے۔ قوموں کے اختلاط و میلاپ اور مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ثقافت کے پُھول بے شک متاثر ہو رہے ہیں لیکن اِسلامی فکر سے نمو پانے والی اقدار اور روایات اتنی جلیل اور توانا ہیں کہ اِن کے مقابل سبھی قوتیں بے رنگ و بے نام ہو جاتی ہیں۔ اِسلامی فکر اور تعلیمات تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ماضی کی طرح آج بھی ہمارے تشخص کی پاسدار ہیں۔

محمد بشیر رانجھا نے آئینہ در آئینہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے فنونِ لطیفہ کے نقش ہائے رنگا رنگ دکھائے ہیں بلکہ صدیوں کو محیط لوک ادب، رقص و موسیقی اور ہزارہ میں مروجہ لوک داستانوں، روایتی کھیلوں، خوشی اور غمی کی صدیوں پرانی روایات، لوک گیتوں اور ماضی میں مروجہ اصنافِ ادب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے عہدِ جدید کے فنکاروں اور قلمکاروں کی کاوشوں کو ماضی سے منطبق کرنے اور اِن اصناف میں نئے سے نئے تجربے کرنے والوں کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

ہزارہ کی ثقافت کے حوالے سے لکھی گئی یہ کتاب ادبیاتِ ہزارہ میں خشتِ اول کا درجہ رکھتی ہے۔اُمید ہے کہ اہلِ قلم اس موضوع کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔

میں ''ہزارہ چیئر'' کے ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد سوز کی کاوشوں کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہوں جنہوں نے معروف ادباء کو ہزارہ کے ادب وثقافت کے حوالے سے کتب تصنیف وتالیف کرنے کے لئے متحرک کردیا ہے۔

میں جناب محمد بشیر رانجھا کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی جانب سے اوراپنے رفقاءکار کی طرف سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد سخاوت شاہ

وائس چانسلر......ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

تاثرات

ثقافت کا تعلق زمین یعنی مادی دُنیا سے ہے۔انگریزی میں اس لئے لفظ Culture استعمال ہوتا ہے۔Sossi-culture،Agri-culture،ثقافۃ۔ زمین میں ہل چلانے کو کہتے ہیں جبکہ تہذیب کا تعلق روحانیات سے یعنی مذہب سے ہے۔اس کے لئے انگریزی میں لفظ Civilization ہے۔لیکن جب سے ''اسلامی ثقافت'' کی بے دلیل اصطلاح وجود میں آئی ہے۔ثقافت وتہذیب کا استعمالِ معنی خلط ملط ہو کے رہ گیا ہے۔

محمد بشیر رانجھا نے ہزارہ کی ثقافت کا تہذیبی پس منظر اسی حوالے سے مرتب کیا ہے حالانکہ رسوم ورواج ،لوک گیت اور لوک کہانیاں ثقافت سے تعلق رکھتی ہیں۔کتاب کی تبویب سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ صاحبِ کتاب ہزارہ کی ثقافت کو عربی تہذیب کا ماحصل بیان کر رہے ہیں لیکن ان کا مقدمہ دوسری طرف کی نشاندہی کرتا ہے یعنی یہ ثقافت سامی النسل،افریقی ،منگول، یونانی ،سیتھی ، پارتھیائی اورکشن قوم کی عادات وخصائل کا مجموعہ ہے۔قطع نظر اس بحث کے جواب رواجِ عام پا چکی ہے، کتاب کو جگہ جگہ سے الٹ پلٹ کر دیکھا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ پہلے دو باب تاریخِ ہزارہ اور ہزارہ کی تہذیب وثقافت کی اساس پر مشتمل ہیں اور خاصے معلوماتی ہیں۔ہزارہ میں عربی زبان وثقافت کا آغاز وارتقا، حواشی اورمنابع کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بے حد سودمند ہے۔چوتھا باب لوک گیتوں کی اقسام سے

متعلق ہے۔ ہزارہ ہونے کو تو ''پھلاں دا کھارا'' ہے لیکن یہاں کے ہر گھر میں ''ہجرت'' کی تپش سینوں میں گرمیاں اور لفظوں میں چنگاریاں اڑاتی پھرتی ہے۔ وجہ.....نوجوانوں کی بے روزگاری اور پنجاب اور سندھ کے کارخانوں کی آبادکاری ہے۔ذرا ایک دو ماہیے سنیں:

میرا ماہیا دُور گیا
زخم جدائیاں دے
اُتے لونڑ بروڑ گیا

....

بجلی ساونڑ دی
کدوں اڈیک کراں
چناں تیرے آونڑ دی

....

چار بیتہ، خوشی وغم کے گیت، کچھ ایسا کلام ہے جس کا شاعر اکثر مونث اور نامعلوم ہے۔تاہم جدید دور کی ہندکو شاعری میں ان اصناف کو بالارادہ معلوم اور معروف شعراء نے اپنالیا ہے۔ان میں آورد کا عنصر یقیناً ہے لیکن وہ سوز معدوم ہے جو ایسی اصناف کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

میں محمد بشیر رانجھا صاحب کی اس محنت اور کاوشِ تلاش کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کو ''ہزارہ رَس'' کی ایک اور اعلیٰ ارتقائی علامت سمجھ کر پڑھا جائے گا۔میں یہ بھی اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں کہ ہزارہ چیئر

کے ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد سوز کو یہ کتاب لکھوانے اور اس کی اشاعت پر مبارک باد دوں اور تسلیم کروں کہ ہزارہ چیئر کے لئے ناظم کے انتخاب نے ہزارہ یونیورسٹی کو مایوس نہیں کیا۔ یہ کام بحیثیت صدر شعبہ اردو میرے لئے ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا اور لائقِ فخر کارنامے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان

صدر شعبہ اردو......ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

اظہارِ تشکّر

زیرِ نظر کتاب ''ثقافتِ ہزارہ اور اُس کا تہذیبی پس منظر'' ہزارہ چیئر کے ایماء پر لکھی گئی ہے۔ مصنف جناب محمد بشیر رانجھا نے تحقیق وتدقیق کے ثبوت قدم قدم پر بہم پہنچائے ہیں۔ اس کتاب کا ہر باب اُن کی محنت شاقہ کی دلیل ہے۔ مصنف نے مختلف کتب کے مطالعے کے بعد کتاب میں شامل کئی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب کا ہر موضوع اور ہر باب ایک مکمل اِکائی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

فاضل مصنف نے ہزارہ میں ثقافت پر لکھنے سے پہلے ہزارہ کے تاریخی پس منظر کو پیش کر کے فطری انداز میں اپنے اصل موضوع پر بحث کی ہے۔ اُنہوں نے برِصغیر کی اقوام اور اُن کی تہذیب وثقافت اور مسلمانوں کی ثقافت کے خصوص میں گہرے اثرات مرتب ہونے کے اسباب وعلل بھی بیان کئے ہیں اور اسلامی ثقافت اور تہذیب وتمدن کی اِنفرادیت کو اُجاگر کرنے میں تاریخی حوالوں سے بھی کام لیا ہے۔

مصنف کو اس بات کا ادراک ہے کہ کسی قوم کی ثقافت گردوپیش کے حالات وآثار کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر اپنا دامن نہیں بچا سکتی بلکہ دیگر اقوام وملل کی ثقافتوں سے غیر شعوری طور پر اثرات قبول کرتی رہتی ہے۔ جو اُس کے تشخص کو بُری طرح مجروح کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً مغلوب، مقہور اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اکثریت میں ہونے والی اقوام سے متاثر ہونا

اور اُن کے تمدن اور اُن کی ثقافت کے رنگوں سے مملو ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں بسنے والی بڑی اقوام اور حکمران طبقہ کے زیرِ نگیں ہم نے بہت کچھ کھویا ہے اور اُن کے اطوار و عادات، رسوم و رواج اور اُن کی ثقافت سے بہر طور متاثر ہوتے رہے ہیں۔

ثقافت کی نمو میں جو سب سے بڑی قوت کارفرما رہتی ہے وہ عقائد ہیں۔ مگر مادی اور معاشی ضرورتوں کے تحت ہم کہیں کہیں لغزشوں کا شکار بھی ہوتے رہے اور کہیں دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کی چکا چوند میں ہمیں اپنے رنگ پھیکے بھی نظر آتے رہے اور ہم دانستہ یا غیر دانستہ طور پر دوسروں کی ثقافت کے رنگ اپنے پیرہن پر لیتے رہے۔ معاشرتی زندگی میں اِن کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ عین فطری عمل ہے۔ ہم ثقافت کے کئی رنگوں سے مملو ہوتے رہے مگر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قوت ہمیشہ ہمیں تقویت عطا کرتی رہی اور ہم اپنی تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ہمیشہ منفرد اور ممتاز رہے۔ سنگ تراشی اور رقص و موسیقی کے حوالے سے ہم دوسری اقوام سے ہمیشہ پیچھے رہے کیونکہ اسلامی اقدار میں ان کی ممانعت ہمارے لئے حرفِ اول کے طور پر رہی۔ گو بدلتے ہوئے حالات اور عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ہم اپنی ثقافت کے نقوش منہدم کرنے میں بھی سبک رفتار رہے پھر بھی ہم عہدِ جدید میں اپنے قومی، ملی اور اسلامی ورثے کے امانت دار نظر آتے ہیں۔ ثقافت اور اسلامی اقدار کی پاسداری

میں اسلامی تعلیمات خصوصاً عربی زبان کی تحصیل صدیوں سے ہمارے کردار اور زندگی کے روز و شب میں ہماری معاونت کرتی رہی۔

فاضل مصنف نے نہایت سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ ہزارہ کی ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس نازک اور اہم موضوع پر اب تک کسی نے بھرپور انداز میں قلم نہیں اٹھایا اور ایک آدھ مضمون لکھنے کے بعد قلم رکھ دینے میں عافیت جانی، محمد بشیر رانجھا نے نہایت اعتماد، استقلالِ مزاج اور استقامت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے متذکرہ کتاب تصنیف کر دی ہے۔ میں ذاتی طور پر اُن کے محقق اور قلمکار ہونے کے اوصاف سے متاثر رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔

''ہزارہ چیئر'' کی فرمائش پر انہوں نے ایک اہم موضوع پر نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ ہم اُن کی اِس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ممنونیت کے ساتھ اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

پروفیسر بشیر احمد سوزؔ
ڈائریکٹر ہزارہ چیئر...... ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

ہزارہ کی تہذیب وثقافت-ایک جائزہ

''ثقافتِ ہزارہ اوراس کا تہذیبی پس منظر'' محمد بشیر رانجھا کی وہ وقیع تصنیف ہے کہ جس میں ہزارہ کی ثقافت اور تہذیب کو معرضِ اظہار میں لاتے ہوئے ملکی سطح پر ہزارہ کے ثقافتی وتہذیبی خدوخال جہاں ملکی تہذیب سے ہم آہنگ ومربوط ہیں وہیں یہ اپنی انفرادی شناخت کا بھی ایک معتبر حوالہ رکھتے ہیں۔ مصنف نے ہزارہ کے تہذیبی وثقافتی عناصر کی کھوج میں اُن جملہ مستند ذرائع سے استفادہ حاصل کیا ہے کہ جو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر کسی نہ کسی طرح ان موضوعات سے متعلق ہیں۔ محمد بشیر رانجھا حرفِ اول میں رقمطراز ہیں:

> ''تہذیب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی آغوش میں ثقافت پروان چڑھتی رہتی ہے۔'' (ص ۲۶،۲۷)

میرے خیال میں اگر مذکورہ صدر بیان کو الٹ کر یوں کہا جائے کہ ثقافت ہی وہ واحد ذریعہ ہے کہ جو تہذیب کی اشاعت کا سبب بنتا ہے تو یہ بات نامناسب نہیں ہوگی۔ چونکہ تہذیب کی اساس ثقافت ہے اور مختلف جماعتوں اور علاقوں کی ثقافتیں باہم مربوط ہوتی ہیں اوران میں ایک حسین امتزاج اور تناسب پیدا ہوتا ہے تو تہذیب وجود میں آتی ہے۔ فاضل مصنف نے خارجی اور داخلی اقدار کی آمیزش سے تہذیب کی وجود پذیری کا اعتراف کیا ہے۔ درحقیقت تہذیب کے خارجی عوامل اور عناصر ثقافت کی وہ ارتقاء یافتہ شکلیں ہیں کہ جو

مذہب، ملک کے سیاسی نظام، شہروں کی حیثیت، صنعت وحرفت کے اداروں اور فنونِ لطیفہ کے حوالے سے اپنی صورت پذیری کرتی ہیں جبکہ تہذیب کی داخلی اقدار کا تعلق براہِ راست افراد کی ذہنیت، اس کی استعدادِ کار، احساسات و جذبات، طرزِ بود و باش سے ہوتا ہے۔ اگر ان تمام داخلی اقدار کا بنظرِ غائر تجزیہ کیا جائے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ داخلی اقدار موضوعی و انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں اور فرد سے ان کا گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور یہی داخلی اقدار درحقیقت ثقافت کی وہ انواع ہیں کہ جو بعد میں اِرتقا یافتہ ہو کر اجتماعی رنگ اختیار کرتے ہوئے خارجی اقدار کا تعین کرتی ہیں۔ Culture اور Civilization کے مباحث نہ صرف ہمارے ہاں بلکہ یورپ میں بھی وضاحت طلب ہیں۔ مصنف نے بخوبی ان تمام تضادات اور امتیازات پر روشنی ڈالی ہے اور اس اعتبار سے اس تصنیف کا ثقافت و تہذیب سے متعلق حصہ بہت جاندار ہے۔ مصنف نے دُنیا کی قدیم تہذیبوں کے تناظر میں بھی تہذیب کے اساسی عناصر کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ قدیم مصری، یونانی، رومی، ایرانی، عربی، آریائی اور یورپی تہذیبوں کا مطالعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب بنیادی طور پر ہزارہ کی تہذیب و ثقافت سے متعلق ہے لہٰذا ان جملہ مباحث کا تجزیاتی مطالعہ بھی اس کتاب کے حسن میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ مصنف نے ہزارہ کے لوک گیتوں، رسومات، لوک رقص، لوک کہانیاں اور کھیلوں کے تناظر میں ہزارہ کی ثقافت کے جملہ اساسی عناصر تک

رسائی کی ہے اور اس طرح ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے پہلی بار ایک باضابطہ کتاب منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ ہزارہ کی ثقافت و تہذیب پر مزید کتب بھی ہزارہ چیئر کے زیرِ اہتمام شائع ہوں گی لیکن محمد بشیر رانجھا کو یہ اعزاز ہمیشہ حاصل رہے گا کہ ہزارہ کی تہذیب و ثقافت پر شائع ہونے والی سب سے پہلی کتاب اُن کی ہے۔ میں انہیں اس تصنیف پر تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ہزارہ چیئر۔ہزارہ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر بشیر احمد سوز کو بھی ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں کہ وہی اس کارِ خیر کے محرک ہیں۔

ڈاکٹر محمد سفیان صفیؔ

شعبۂ اردو......ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

حرفِ اول

ایک پرانی کہاوت ہے کہ ''انسان ایک سماجی حیوان ہے'' لیکن اس کی معنویت، افادیت اور اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی ارسطو کے زمانے میں تھی۔ فرد سماج میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے افکار و نظریات کی ترتیب و تہذیب بھی اسی سماج میں ہوتی ہے۔ سماج سے الگ رہ کر کوئی بھی فرد اپنی زندگی بہ حسن و خوبی نہیں گزار سکتا۔ اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا دانشور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جو کچھ بھی ذخیرۂ انسانی میں اضافہ کیا ہے وہ اس کی انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس عمل میں انفرادی قوت و توانائی شامل ہوتی ہے مگر اسے بروئے کار لانے میں سماج اور افراد کا ایک خاص کردار رہتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ انسانی زندگی کی ترتیب و تزئین معاشرے سے ہی ممکن ہے۔ فرد اسی معاشرے میں ماضی، حال اور مستقبل کے ادوار سے دوچار رہتا ہے۔ اسی لئے فرد اپنے وجود کی بقا اور اجتماعی زندگی کا دستِ نگر رہتا ہے۔ اسی سماج میں رہ کر فرد زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے آشنا ہوتا ہے اور ان سے ہی اثر قبول کرتا ہے۔ اس پورے عملی تسلسل میں سماج کے تہذیبی و ثقافتی عناصر و عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔

تہذیب و ثقافت اور تہذیب و تمدن جیسے الفاظ ہماری روزمرہ کی

گفتگو اور تحریروں میں بہ کثرت استعمال ہوتے رہتے ہیں ۔کبھی تہذیب و ثقافت کوبطور مترادف کے استعمال کیا گیا ہےتو کبھی ان کی معنوی حقیقت پر غوروخوض کیے بغیر مبہم طور پر استعمال کر دیا گیا ہے۔ انگریزی میں Culture اور Civilization اسی طوراستعمال ہوتے رہے ہیں۔اکثر سید عابد حسین کے بقول ’’تہذیب، اقدار کےاُس ہم آہنگ شعور کا نام ہے جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے ۔جسے وہ اجتماعی احساسات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے ۔جسے افراداپنے جذبات ، رجحانات ، اپنے سبھاؤاور برتاؤ کو ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو مادی اشیاء پرڈالتے ہیں ۔‘‘

آخر وہ کون سی اقدار ہیں جوتہذیب کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیتی ہیں؟ یہ خارجی اور داخلی دوطرح کی اقدار ہیں ۔ملک اور ملک کا سیاسی نظام ،شہروں کی حیثیت ،صنعت وحرفت کے ادارے،فنونِ لطیفہ کے کارنامے ،اکتساب علم کا شوق...... یہ سب خارجی اقدار ہیں اور افراد کی ذہنیت ، ان کا علم ، ان کی استعداد، ان کے احساسات ، ان کے حوصلے اور ان کے وہ اصول جن کے مطابق ان کے باہمی تعلقات متعین ہوتے ہیں ......داخلی اقدار کہلاتی ہیں ۔

داخلی اقدار میں مذہبی اُمور کا بھی دخل ہے ۔کسی جماعت یا سماج کامذہب ، اس کے افراد کے عقائد، اخلاق و عادات ، اس کے تجربات و مشاہدات ، یہ سب کے سب تہذیبی اقدار کی تعمیر وفروغ میں معاون ہوتے ہیں ۔نیز یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی سماج میں جذبات واحساسات کی پیش کش میں کس حد تک جمالیاتی عناصر شامل ہیں ۔فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف کو افکار و

نظریات کی کرنوں سے کس قدر رنا بانیاں بخشی گئی ہیں۔ ان امور کو بھی داخلی اقدار میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی بھی سماج کی تہذیبی قدریں کبھی یکساں نہیں ہوتیں۔ جس طرح ہر ایک آدمی اپنی شباہت کی بنیاد پر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اسی طرح ہر ایک جماعت کی اپنی منفرد شناخت ہوتی ہے۔ یہ شناخت تہذیبی قدروں کے غیر مماثل ہونے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

تہذیب کوئی جامد شے نہیں۔ انسانی زندگی اور اس کے روزمرہ میں ہمیشہ اور ہر لحہ تغیّر اور تحرک برپا رہتا ہے۔ تغیر ایک فطری سا عمل ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسی لئے تہذیب بھی اپنی پرانی کینچلی اتار کر نئے پیراہن میں آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوامِ عالم کی کئی تہذیبوں کو عروج حاصل ہوا جو ایک خاص مدت کے بعد رو بہ زوال ہو گئیں۔ اقوامِ عالم کی چند مشہور تہذیبوں میں یونانی، مصری، رومی، ایرانی، عرب، سندھ، آریہ، بدھ مت، ہڑپہ، موہن جو داڑو، اشوکہ، گپت، کشانی، مغل اور یورپی تہذیب شامل ہیں۔ جب ہم برصغیر کے پس منظر میں بات کرتے ہیں تو وادیٔ سندھ کی تہذیب (جسے عرفِ عام میں دراوڑوں کی تہذیب کہا جاتا ہے) سب سے قدیم تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد آریہ تہذیب اپنی قدامت کے لحاظ سے پرانی تہذیب کہلاتی ہے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے پیشِ نظر دراوڑی آریائی اور رویدک عہد کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پر محیط ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے

ویدک عہد اپنی شکل و صورت کھو کر بدھ اور جین مذہب کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ اس پورے عہد کے ماحول اور ثقافتی عوامل میں ایک طرح کا ربط و تسلسل نظر آتا ہے جو ہندوستانیوں کی زندگی میں رچ بس گئے تھے۔ دُنیا کے دوسرے ممالک کی تہذیبوں کی طرح یہاں کی تہذیب میں بھی ہمیشہ تغیرات ہوتے رہے اور مختلف تہذیبوں کے دھارے اس میں آ کر ملتے رہے۔

تہذیب کے بعد ''ثقافت'' کو دیکھا جائے تو اپنے وسیع تر مفہوم میں یہ انگریزی کے لفظ Civilization اور اردو زبان میں مستعمل کلچر کے مترادف ہے جو ایڈورڈ ٹیلر کے بقول ایک پیچیدہ کل ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاقیات، قانون، رسم و رواج نیز معاشرہ کے ذریعہ اپنائی گئی دوسری استعداد اور عادات شامل ہیں۔ ثقافت کے تمدنی مظاہر میں آداب و اطوار، خورد و نوش، فنونِ لطیفہ اور مافی الضمیر کے اظہار کے وسائل آتے ہیں، اس میں کسی خاص جماعت یا گروہ کی پہچان ہوتی ہے۔ ثقافت کے زمرے میں جو بھی عناصر آتے ہیں وہ سب کے سب شخصی طور پر قبول کئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک نسل سے دوسری نسل تک اس کی منتقلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ثقافت کی ایک یہ خوبی بھی ہے کہ یہ اپنے ماضی سے حال کو متاثر کرتی ہے جس سے مستقبل متشکل ہوتا رہتا ہے۔

تہذیب اور ثقافت تقریباً ایک ساتھ چلتے رہتے ہیں، دونوں میں کبھی کبھی مشابہت بھی نظر آتی ہے اور کبھی کبھی دونوں کے مابین خطِ امتیاز بھی نظر آتا ہے۔ البتہ تہذیب ہی واحد ذریعہ ہے جس کی آغوش میں ثقافت پروان چڑھتی

رہتی ہے۔معاشرہ اور ثقافت کا سفر فرد ہی سے شروع ہوتا ہے اور ثقافت اور سماج کے مشترک اثرات سے فرد اقدار کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔اس طرح فرد اور سماجی و ثقافتی عناصر کے درمیان ایک ربط پیدا ہوتا ہے۔اس ربط کی ایک اہم کڑی لوک ادب ہے۔لوک ادب کے تہذیبی و ثقافتی مطالعے سے کسی عہد کی ذہنی و عقلی رفتار کے سفر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کیونکہ ہر دور کا لوک ادب اپنے دور کی جیتی جاگتی تصویریں اور معاشرتی قدریں پیش کرتا ہے۔

ہزارہ کی تہذیب و ثقافت بہت سی چیزوں کے تال میل سے وجود میں آئی ہے۔اگر میں اس کی کوئی نظیر پیش کرنا چاہوں تو واحد چیز جس سے ثقافتِ ہزارہ کو مماثلت دی جا سکتی ہے وہ امریکی قومیت ہے۔جس طرح امریکہ میں یورپ کی مختلف قومیتوں کے ترکِ وطن کرنے والے افراد نے گھل مل کر ایک الگ قوم کی شکل اختیار کر لی ہے بالکل اسی طرح ان علاقوں کو (جن پر اب ہزارہ مشتمل ہے) ایک ایسے بڑے ثقافتی طاس کی حیثیت حاصل رہی ہے جس میں ہر جانب سے اور ہر زمانے میں مختلف قوت اور وسعت کے دھارے بہہ کر آتے رہے ہیں۔ازمنہ قدیم میں آسٹریلیا میں جا کر آباد ہونے والے سامی النسل افریقی ،منگول، ایرانی، یونانی، سیتھی، پارتھیائی اور کشن قوم کے لوگ اس علاقے میں آئے۔ازمنہ وسطیٰ میں عرب، ترک اور پٹھان آئے۔پٹھانوں کے بعد وہ عظیم مغل آئے جن کی یاد ابھی تک حافظے میں تازہ ہے۔مغلوں کے بعد آنے والے انگریز تھے جنہوں نے تمام جدید چیزوں کو رواج دیا۔ان تمام لوگوں کی ثقافتوں کا مجموعہ وہ چیز ہے جسے ہم ہزارہ کی ثقافتی

میراث کہتے ہیں۔لیکن جب میراث کے سوال پر آتے ہیں تو ہمیں ایک فرق کا لحاظ رکھنا پڑے گا ...... کیا وہ تمام چیزیں جو ہمیں ورثے میں ملی ہیں ہماری ثقافت کا جزو ہیں؟ میں یہ کہوں گا کہ ایسا نہیں ہے۔ یقیناً یادگاریں ہماری میراث کا حصہ ہیں لیکن اس علاقے میں وقتاً فوقتاً زندگی کے متعلق جو تصور رہا ہے اس میں فرق پڑتا رہا ہے۔مثال کے طور پر میں موہن جوداڑو کی منصوبہ بندی کی تعریف کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں اس بات سے بھی آگاہ ہوں کہ ہمارا عقیدہ پروہت راجہ کے عقیدے سے مختلف ہے۔ وہ سورج کا پجاری تھا اور ہمارا ایمان ایک ایسے خدا پر ہے جو نورالسموٰت والارض تو ہے، سورج نہیں ہے۔اس ضمن میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے اس علاقے میں وقتاً فوقتاً لوگوں کے جو بھی معتقدات رہے ہوں ان کی جگہ مکمل طور پر اسلام نے لے لی ہے۔جس کا ذات اور کائنات کے بارے میں خود اپنا ایک تصور اور ایک نظریہ ہے۔

ثقافت ...... مذہب، تاریخ اور جغرافیہ سے عبارت ہے جسے دل، دماغ اور دھرتی نمو بخشتے ہیں۔ دِل ماحول کی اشیاء اور تصورات کو محسوس کرتا ہے، دِماغ سوچتا ہے اور اشیاء و تصورات کی تراش خراش، آراستگی و پیراستگی اور نوک پلک سنوارنے میں مسلسل مصروف رہتا ہے اور دھرتی دِلوں، دماغوں ،محسوسات اور سوچ کے تبادلے کے امتزاج کو نت نئے روپ دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔جب سے انسانی معاشرے میں بستی، قبیلے اور دیس کے روپ میں منظم زندگی کا آغاز ہوا ہے ثقافت کی بنیاد مذہب ہی رہی ہے۔کسی

زمانے میں مذہب جادوگری اور اوہام کا دوسرا نام تھا، پھر آگ کی پرستش اور بتوں کی پوجا کا نام بنا اور اس کے بعد توحید کے تصور نے مذاہب کو نیا رنگ دیا۔ اس دوران میں سوچنے، سمجھنے اور رہن سہن کے سارے پہلو مذہب کے تابع نہیں تھے تو کم از کم اس سے متاثر ضرور تھے۔

روحانی اور جذباتی زندگی کے پہلو بہ پہلو معاشی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس میں جغرافیہ کارفرما ہوتا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں میں بسنے والے انسانوں کی زندگی مختلف ہوتی ہے اور ریگستانوں میں آباد انسانوں کی مختلف، سبزہ زار پہاڑی علاقوں میں زندگی کا ایک روپ پایا جاتا ہے اور میدانی علاقوں میں دوسرا۔ دریاؤں اور سمندر کے کنارے آباد لوگوں کی زندگی ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور بے آب وگیاہ علاقوں میں زندگی کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ دیہات میں زندگی کا رنگ ڈھنگ ایک ہوتا ہے تو شہروں میں دوسرا کہ وہاں مختلف طور طریقوں کے امتزاج اور انسانوں کے میل جول سے زندگی ایک نیا روپ دھار لیتی ہے۔

مذہب اور معاش جب مختلف مراحل سے گزرتے ہیں تو انہی سے تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے۔ کسی خطے میں بسنے والے افراد کی زبانیں زیادہ بھی ہوسکتی ہیں اور زبان ایک ہو تو بنیادی ڈھانچہ ایک ہی رہتا ہے لیکن مختلف علاقوں میں اس کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ زبانوں کی کوکھ سے پہلے لوک کہانیاں، پھر لوک رومان، لوک گیت اور اس کے بعد تحریری ادب جنم لیتا ہے۔

انسانوں کے میل جول سے اخلاقی قدریں ترتیب پاتی ہیں،

روایات جنم لیتی ہیں، محبت کے بارے میں، شجاعت کے بارے میں، مہمان نوازی کے بارے میں، مذہب، معاش، جغرافیہ، ادب، تفریحات، اخلاقی اقدار اور روایات ان بندھنوں کا کام دیتے ہیں جن سے ایک خطے کے اندر رہنے والے قبائل اور عوام ایک قوم کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہیں سے ایک الگ قومی تشخص جنم لیتا ہے۔ یہیں سے اس کی حفاظت کے لئے اتحاد و استحکام کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ثقافتی شناخت ایک اہم عنصر بن جاتی ہے۔

ہزارہ کی تاریخ محض جنگجوئی سے متعلق بیان پر مبنی نہیں بلکہ اس کی جڑیں ادب وفن، تعمیرات، غذا اور غذائی عادات، ظروف اور سب سے بڑھ کر سوچ اور طرزِ فکر تک کے انقلابات میں پنہاں ہیں۔ یہاں فن کو مذہب سے آزادی ملی اور اسے زندگی کا بلا واسطہ جزو بنایا گیا تا کہ یہ دنیاوی میدانوں میں مسرت و انبساط کا ذریعہ بنے۔ فن تعمیرات کو مثالی بلندیاں عطا کیں۔ جس میں صراحت، وسعت، کشادگی، توازن و تناسب کے علاوہ قرینے اور نقشہ بندی میں حسن و تزئین کو اُجاگر کیا گیا۔ غذا اور غذا سے متعلق عادات و اطوار اور پسند و ناپسند میں بھی اس طرح ماضی کی خالصتاً انفرادی نزہت و عفت پر مبنی فلسفیانہ موشگافیوں کے برعکس سماجی اور اجتماعی روایات کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہاں کے ظروف اپنی اشکال، بناوٹ اور تکنیک میں ایران اور وسط ایشیا سے ماخوذ نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ادبی روایات ہیں۔

غزنوی دور میں یہاں تشکیل پائے جانے والے ادب نے انقلابی انداز میں ہمعصر سنسکرت اور برہمنی دیومالاؤں کی طبقاتی برتری کا تختہ الٹ کر

اپنی ترقی و ترویج کے لئے راہ بنائی ۔عربی و فارسی زبان و ادب کی نشاۃ ثانیہ نے ادبی فکر کی بنیادوں کو بدل کر رکھ دیا۔ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کا از سرِ نوتعین ہوا۔ یہ نئی ادبی روایات اسلامی سلطنت کی وسعت کا باعث بھی بنی ۔ نوشیروان کا انصاف، رستم کی جرأت وقوت، امیر خسرو کی رومانیت، شیریں فرہاد کا عشق، یوسف زلیخا کی داستان اور اسی نوع کی دیگر اصناف پر مبنی ایک عظیم ورثہ کی کاشت ہوئی جس نے آگے چل کر ایران، افغانستان، تاجکستان اور پاکستان کی ادبی روایات کو جنم دیا۔عوام نے جب سنسکرت کا جادو توڑا تو سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، ہندکو، کشمیری، اردو اور دیگر زبانوں کی صورتیں اُبھرنے لگیں ۔ زبان و بیان میں سادگی آنے کے باعث عوامی حلقوں میں جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے جو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اس نے تمام علاقائی حدبندیوں سے بالاتر ہوکر اس عظیم عجمی ورثے کا ایسا اشتراک قائم کیا جو بیک وقت ہمارے پورے ملک کا بالعموم اور اس خطۂ زمین یعنی ہزارہ کا بالخصوص ورثہ اور ملکیت ہے ۔

عشق و رومان، لوک کہانیوں ، داستانوں، قدرتی مناظر کے بیان اور انسانی فن کی عکاسی کے علاوہ ادب کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ ہمعصر معاشرے کے حسن وقبیح کا مظہر ہو اور انسان اور خدا کے درمیان رشتوں کی تشریح بھی کرتا ہو۔ ادب کا مقصد عظمت کے حصول کے لئے انسان کی جدوجہد بیان کرنا ہی نہیں ۔مہم جوئی، جرأت و بہادری، مزید آگے بڑھنے کی لگن اور مزید کے حصول کے لئے محرک ایک فریضہ بھی ادا کرتا ہے ۔اس خطۂ

سر زمین کے درویشوں، فقیروں اور صوفیاء نے پر امن جد و جہد کی ایک اہم مثال قائم کی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو پر سکون انداز میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک خانقاہ سے دوسری خانقاہ اور ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک پہنچایا۔ یہ بھائی چارہ معاشرے کی یک جہتی اور ایک خدا کے حضور سر بسجود ہونے اور اپنی زندگی کو پر امن حکمت عملی، مہذب اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے تحت گزارنے کے عملی پیغام پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس دور کا ادب ہمیں خطبات و شاعری سے معمور ملتا ہے۔ ادب کو اعلیٰ مقاصد کے لئے بطور ذریعہ استعمال کرنے کی یہ غیر فانی روایت ہے۔

تاریخ دراصل انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کل نوعِ انسانی کے پچھلے تجربات کا ریکارڈ محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے اور اپنے مستقبل کو آزمودہ بھلائیوں سے درست اور آزمودہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ تاریخ کے ریکارڈ کا جائزہ لینے کے لئے تین نقطہ نظر ممکن ہیں۔ پہلا نقطہ نظر محض معروضی مطالعے کا ہے یعنی حالات و واقعات جیسے کچھ بھی گزرے ہیں انہیں جوں کا توں دیکھا جائے۔ دوسرا نقطہ نظر قوم پرستانہ مطالعے کا ہے یعنی اہم واقعات کو کسی مخصوص نسل یا قوم یا ملک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں جس سے ہمارا تعلق ہے اور اسی لحاظ سے نتائج اخذ کریں اور اسی لحاظ سے اشخاص و اقوام کے متعلق رائے قائم کریں۔ تیسرا نقطہ نظر مقصدی اور اصولی ہے یعنی ہم نسلی اور قومی تعصّبات سے بالاتر ہو کر مجرد انسانی

فلاح وسعادت کو مقصود ٹھہرا کر اور نیک و بد کا ایک بے لاگ معیار سامنے رکھ کر نسلِ اِنسانی اور اس کے مختلف اجزاء کے کارناموں کو جانچیں اور بے لاگ رائے قائم کریں۔

پہلا نقطہ نظر اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس طرح کے مطالعے سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دوسرے نقطہ نظر میں بظاہر بڑی جاذبیت ہے لیکن دُنیا میں اکثر جھوٹ اسی مطالعے کی بدولت پھیلے ہیں۔ اکثر ظلم، بے انصافیاں، خونریزیاں اور قومی و نسلی عداوتیں اسی کی وجہ سے برپا ہوئی ہیں۔ اکثر بروں کو اچھا، ظالموں کو مظلوم اسی طرزِ مطالعہ نے ہی ظاہر کیا ہے۔ انسانیت کو مجروح کرنے اور زمین کو فساد سے بھرنے میں تاریخ کے اس طرزِ مطالعہ کا کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ تیسری قسم کا مطالعہ یقیناً سب سے بہتر ہے مگر اس کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے اول یہ کہ بجائے خود انسانی فلاح و سعادت کا نظریہ درست اور نیک و بد کا معیار صحیح ہو اور دوسرے یہ کہ واقعات جن پر استدلال کی عمارت اٹھائی جاتی ہے معروضی مطالعے کے ذریعے اخذ کئے گئے ہوں نہ کہ اپنے نظریے کو سامنے رکھ کر ان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا گیا ہو۔

ہزارہ کی تاریخ کے مجرد مطالعے کے بعد بھی اس کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جو اس خطے کی تہذیب و ثقافت کی قدامت کے باوجود اسلامی تمدن اور کلچر کے انتہائی قریب نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ انہیں فطرت کے اٹل اصولوں کے قریب ترین کہہ سکتے ہیں۔ اس مطالعے میں میری یہ شعوری

کوشش رہی ہے کہ وہ معلومات بہم پہنچائی جائیں جو اب تک ہزارہ کے محققین کی نظروں سے اوجھل ہیں یا مختلف کتب میں جا بجا بکھری ہوئی ملتی ہیں اور تاریخ میں ان کی اہمیت کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ۔

ثقافت کے اصطلاحی معنی انسانوں کے طریق زندگی کے ہیں یعنی انسان کس طریقے اور سلیقے سے رہتے ، ملتے جلتے، کھاتے پیتے، بولتے گاتے اور زندگی بسر کرتے ہیں ۔گویا مجموعی طور پر طرزِ معاشرت کو ثقافت کا نام دیا گیا ہے ۔اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ بھوک ایک جبلی شے ہے اس لئے یہ ثقافت میں شامل نہیں لیکن اس مٹانے کے لئے جو طریقے استعمال ہوتے ہیں انہیں ثقافت میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ماہرین کے مطابق ثقافت ماحول اور ضرورت کے تحت جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے ۔ثقافت ہر شخص کی ضرورت ہے اور ہر شخص ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے ۔

تہذیب ثقافت کی ایک شاخ ہے جس میں تحریر کا ستعمال ،شہروں کا وجود، سیاسی ردوبدل اور پیشہ ورانہ تخصیص شامل ہے ۔جدید دور کے محققین نے ثقافت کی حدود مذہب، فلسفہ، آرٹ اور معاشرت کو شامل کیا ہے اور تہذیب میں ہر طرح کے تکنیکی علوم کو بھی شامل کیا ہے ۔ثقافت کی طرح ہر شخص تہذیب میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا اور یہ اس کے لئے ضروری بھی نہیں ۔ ثقافت کی ترقی میں تہذیب ایک اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ثقافت تہذیب یافتہ بھی ہوسکتی ہے اور غیر مہذب بھی ۔مثلاً حجری دور کی ثقافت ۳۰۰۰ قبل مسیح میں تہذیب یافتہ ہو چکی تھی کیونکہ اس وقت تحریر اور شہر وجود میں آچکے تھے ۔ہزارہ

کی قدیم تہذیب کو ہم محض اسلامی نہیں کہہ سکتے ۔اگر ہم ایسا کریں گے تو اس کی قدامت کئی ہزار سال سے کم ہو کر محض محمد بن قاسم کی دیبل میں آمد یا پھر اس خطے کے جغرافیائی محل وقوع کی بدولت ترک حملہ آواروں کے ادوار سے شروع کرنا پڑے گی جو محل نظر ہے۔

تمدن بھی تہذیب کی طرح ثقافت کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ مدینہ سے نکلا ہے جس کے معنی شہر کے ہیں ۔تمدن کو شہر کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تمدن شہروں کے بغیر وجود میں نہیں آتا ۔ گویا تمدن شہری طرزِ معاشرت و معیشت کا نام ہے۔غلطی سے تمدن کو تہذیب کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔جب ہم ہڑپہ یا قدیم روما کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل ہم اس کے تمدن کی بات کرتے ہیں۔تمدن عارضی اور مقامی ہوتا ہے ۔ہر قوم اور علاقے کے ساتھ اس کا تمدن نشوونما پاتا اور بالآخر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتا ہے۔

انسانی زندگی تہذیبی سانچوں میں ڈھل کر ہی اپنے مفہوم کا تعین کرتی ہے۔ہوتا یہ ہے کہ انسان تہذیبی علامتوں کے ذریعہ اپنی روح سے گفتگو کرتا ہے یا یوں کہیے کہ تہذیب نفس کرتا ہے۔انہیں علامتوں کو ہضم کر کے اور ان کے مفاہیم کو سمجھ کر وہ اپنے شعور میں اضافہ کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان علامتوں کو اپنی زندگی کا رہنما اصول بنا کر وہ دیگر علامتوں کو جنم دیتا ہے۔یہ علامتیں ویسے تو جسمی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر ان کے مفاہیم کا شعور حاصل کر کے ہم زندگی کی اقدار کا احساس کرتے ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہماری قدریں محض تجرید ہوتی ہیں جن کی تجسیم علامتیں ہوتی ہیں ۔

ثقافتِ ہزارہ کا موجودہ رنگ غالب طور پر اسلامی ہے اور اسے بالعموم اسلامی ثقافت ہی کہا جاتا ہے۔ میں اس تصور کی زیادہ گہرائی میں نہیں جانا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا احساس ہے۔ میں بس یہی کہوں گا کہ اسلام سے مراد خدا کی واحدانیت، بنی نوع انسان کی وحدت اور مساواتِ انسانی پر اصرار ہے۔ میرے عقیدے کے مطابق اسلامی ثقافت کا ایک نمایاں ترین جزو جستجو کا جذبہ ہے اور اسی کی ایک اہم خصوصیت اس کی زندگی کو بھرپور بنانے کی خواہش ہے۔ انسان محض اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ وہ زندگی کے ایک مخصوص رخ کو دیکھ لے۔ اس کے سامنے پوری زندگی ہوتی ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کتابِ زندگی کے ایک ایک نقطے کو پرکھے گا۔ میں اس کا تذکرہ اس لئے کر رہا ہوں کہ اس تصور نے ان لوگوں کے پورے زاویۂ نظر کو متاثر کیا ہے جنھوں نے بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے خوبصورت مساجد، شاندار مدرسے اور ملک گیر شاہراہیں تعمیر کی ہیں۔

ہزارہ کی ثقافتی میراث میں فنِ تعمیر، مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونے، چھوٹی تصویروں کی نقاشی، سنگ تراشی، سفال سازی اور ذیلی فنونِ لطیفہ سبھی کچھ شامل ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں میں نے ہزارہ کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کے خدوخال کے ابتدائی نقوش کی تلاش اور توضیح کے لئے یہاں کے لوک ادب، ثقافت اور اس کے تشکیلی عناصر کو نمایاں کرنے پر زیادہ زور دیا ہے......اور خاص طور پر اسلامی تشخص اور تہذیب کے پہلو بہ پہلو رہ کر یہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے......جس کے پیچھے شاید

میرا اپنا ایک زاویہ نظر اور تحقیقی اور تنقیدی شعور ہے جسے آپ آئندہ ابواب میں دیکھ سکیں گے۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات آپ تک پہنچاؤں اور تحریر کو بوجھل پن سے بچانے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے غیر ضروری حواشی اور حوالہ جات سے بھی اجتناب برتا ہے۔البتہ دو ابواب ''ہزارہ: مختصر تاریخی پس منظر'' اور ''ہزارہ میں عربی زبان وثقافت کا آغاز وارتقاء'' چونکہ بعض تفاصیل کا تقاضا کرتے تھے اس لئے میں نے مزید مطالعے کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے آخر میں حوالہ جات کا اضافہ کر دیا ہے تا کہ قارئین بنیادی ماخذات تک رسائی حاصل کر کے تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔

میں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے وہ ماخذات جو اہلِ ہزارہ نے جمع کیے ہیں، انہیں دانستہ طور پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ دستیاب کتب کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان بنیادی ماخذات میں بے شمار باتوں کی تکرار اس تواتر سے کی گئی ہے کہ ان کی حیثیت مشکوک ہو کر رہ گئی ہے......خاص طور پر ہزارہ کی اقوام میں پہلا سیر ہے تو دوسرا سوا سیر...... ہر ایک انگریز کا باغی، سکھوں کا دشمن اور مغلوں اور دُرّانیوں کا ہم پیالہ و ہم نوالہ......اگر ایسا ہوتا تو غیر مسلم اتنی طویل مدت تک اس علاقے پر قابض نہ رہ سکتے۔خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات درمیان میں آ گئی ......ہم اس خطے کی ثقافت کے حوالے سے دیکھیں تو ہر لحاظ سے بھرپور اور دلکش ہے...... یہاں کی ثقافت میں زندگی کے وہ تمام رنگ نظر آتے ہیں جو ایک جاندار، زندہ جاوید اور زندگی

کی لطافتوں سے سرشار معاشروں میں نظر آ سکتے ہیں۔

ہزارہ میں بے شمار لوگوں نے خالصتاً اس کی تاریخ، ثقافت اور ادب پر کتب اور مضامین لکھ کر اس خطے کی خدمت ضرور کی ہے لیکن ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی، ڈاکٹر قاری فیوض الرحمٰن اور پروفیسر بشیر احمد سوزؔ کی وہ خدمات انتہائی لائقِ تحسین ہیں جو انہوں نے اس خطے کی تاریخ وثقافت، زبان و ادب اور خاص طور پر علمائے ہزارہ کی تصنیفی و دینی خدمات کے آثار کو جمع کرنے پر صرف کیں۔

راقم نے بھی اپنی زندگی کا انتہائی اہم حصہ، جو کم و بیش ۴۳ برسوں پر محیط ہے، اسی خطے کے ایک تاریخی شہر ایبٹ آباد میں بسر کیا...... درمیان میں چار چھ سال اس سے وقتی دُوری ضرور رہوئی لیکن میرے رابطے اور وابستگی اس شہر اور یہاں کے علم دوست حلقوں کے ساتھ ہمیشہ رہی۔ میری یہ معمولی سی کاوش اس شہر اور سرزمینِ ہزارہ کے دوستوں بالخصوص شعر و ادب سے وابستہ مہربانوں کی طرف سے ملنے والی محبتوں کا خراج ہی تو ہے...... میں اپنے انتہائی مخلص دوستوں خاص طور پر ہزارہ کے معروف افسانہ نویس اور کالم نگار جناب ساجد خان، شاعر و انشائیہ نگار جناب محمد اسفر آفاقی، ہزارہ کے اُبھرتے ہوئے مزاح نویس اور شاعر جناب خورشید احمد عون اور خوبصورت لہجے کے شاعر و ادیب اور نقاد جناب کاشف بٹ کی بعض مسائل و معاملات میں مشاورت کا بھی تہ دِل سے سپاس گزار ہوں...... اللہ ربُّ العزّت سے دُعا گو ہوں کہ میری اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے ہمکنار فرمائے ......(آمین)

دعا گو

محمد بشیر رانجھا عفی عنہ

باب:اول

ہزارہ......مختصر تاریخی پس منظر

ہزارہ قبل مسیح سے بہت پہلے کی تاریخ رکھتا ہے۔طوفانِ نوح کے بعد دُنیا کا آغاز نئے سرے سے ہوا اس لئے حضرت نوحؑ کو" آدمِ ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔طوفانِ نوح کے بعد صرف وہ افراد زندہ بچے جو حضرت نوحؑ کے پیروکار اور توحید کے ماننے والے تھے۔ان میں حضرت نوحؑ کے تین بیٹے"جام، یافث اور سام" بھی شامل تھے۔ سام کے ایک بیٹے کا نام "ہند" تھا۔اسی نام پر ہندوستان آباد ہوا۔ہند کی نویں پشت سے ایک جری، بہادر اور دلیر انسان پیدا ہوا جس کا نام "سورج" تھا۔تمام شمال مغربی ہندوستان پر سورج کی حکمرانی تھی۔موجودہ ہزارہ کا علاقہ بھی اسی کی قلمرو میں شامل تھا۔ اس سلطنت کا پایہ تخت دریائے جہلم کے کنارے کوہستانِ نمک کے پہلو میں آباد شہر بھیرہ (ضلع سرگودہا-پنجاب) تھا جو اپنے زمانے میں بہت بڑا علمی، تجارتی اور ثقافتی مرکز تھا۔سورج کے بعد اس کے جانشینوں میں شنگل مہراج اور کیدراج شامل تھے۔یہ تینوں یکے بعد دیگرے اس سلطنت کے تاجدار بنے۔شنگل فتوحات کا دلدادہ تھا۔اس نے ایک عظیم فوج تیار کی اور مختلف علاقوں کو روندتا ہوا قنوج جا پہنچا۔والئی قنوج نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن میدان کارزار میں کام آیا اور قنوج شنگل کے زیرِ نگین آ گیا۔اس زمانہ میں بھی اس عظیم سلطنت کا دارالحکومت بھیرہ (پنجاب) ہی تھا۔

شنگل اولادِ نرینہ سے محروم تھا اور اس کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے یوں اس عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔قنوج پر ''کچھواہا'' قوم کے ایک سردار نے قبضہ کرلیا ۔یہ سردار ۵۰۰ قبل مسیح میں مارواڑ سے آیا تھا۔قنوج پر قبضہ کے بعد ہزارہ کا علاقہ شنگل کے جانشین مہراج کے قبضے میں رہا۔مہراج ۳۴ سال تک اس علاقے کا حکمران رہا۔مہراج نے اپنے بھانجے کیدراج کو اپنا جانشین مقرر کیا ہوا تھا......لہٰذا مہراج کی موت کے بعد کیدراج ۴۶۶ قبل مسیح میں سریرآرائے سلطنت ہوا۔ یہ ایک بہادر انسان تھا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ۔اس زمانہ میں پنجاب کا علاقہ ایرانی گورنر رستم دستاں کے زیرِ نگیں تھا ۔کیدراج نے رستم دستاں کو شکست دے کر قتل کر دیا اور پورے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا (۱)۔

کیدراج کی موت کے بعد ۴۴۳ قبل مسیح میں یہ علاقہ بدنظمی کا شکار ہو گیا۔ طوائف الملوکی سے ہمیشہ دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ کشمیر کے علاقہ کی ایک قدیم قوم سوفیتس (Sophites) کے سرداروں نے ایک بھاری فوج کی مدد سے علاقہ پر قبضہ کرلیا ۔یوں موجودہ ہزارہ کا تمام علاقہ ان کے قبضے میں آ گیا۔جب ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندرِ اعظم نے برِ صغیر کا رخ کیا تو کوہستانِ نمک کا تمام علاقہ سوفیتین کی عملداری میں شامل تھا۔سکندرِ اعظم کی آمد پر سوفیتسن قوم کے بادشاہ نے اس سے صلح کرلی تھی......اس بادشاہ نے سکندرِ اعظم کو ایک عجیب وغریب کتا پیش کیا جو جسمانی طور پر غیر معمولی تھا۔ اس کتے نے بیک وقت ایک شیر اور ہاتھی پر حملہ کیا اور دونوں کا پچھاڑ دیا (۲)۔

پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ سوفیتسن بادشاہ کو نمک سے سونے اور ہیروں سے بھی زیادہ محاصل ملتا تھا ۔امپیریل گزیٹر آف انڈیا کے مطابق سوفیتسن حکمرانوں نے

یونانی سپہ سالا کراٹیراس (Kraterus) اور ہیفاسٹن (Hephaestin) کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور کوئی مزاحمت نہ کی (۳)۔ الیگزینڈر کنگھم کے مطابق سکندرِاعظم کے حملہ کے وقت سوفیتیس سلطنت کا دارالحکومت بھیرہ ہی تھا اوران کے علاقے کی سرحدات کابل، کشمیر، لاہور اور ملتان کے ساتھ ملتی تھیں (۴)۔

سکندرِاعظم کی موت کے بعد ۳۲۰ قبل مسیح میں موریہ خاندان نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ مگدھ کے نند خاندان کے راجہ موریہ نے اپنے استاد کوٹلیہ کی مدد سے پنجاب پر بھی قبضہ کرلیا۔ چندر گپت موریہ کا انتقال ۲۹۷ قبل مسیح میں ہوا تو اس علاقہ کے عوام نے ایک بار پھر خودمختاری حاصل کرلی اور یہ دور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت تک رہا۔

یہ خطہ مختلف ادوار میں مختلف فاتحین اور حملہ آور اقوام وقبائل کے زیرِ تسلط رہا۔ روایت ہے کہ ۳۲۶ قبل مسیح میں جب سکندرِاعظم نے اس علاقہ پر حملہ کیا تو اورہزارہ کا پورا علاقہ اس کی قلمرو میں شامل ہوگیا۔ سکندرِاعظم نے اپنے ایک سپہ سالار ابی سارا (Abisara) کو یہاں کا حاکم بنایا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اسی جنرل ابی سارا (Abisara) کے نام کی بدولت کافی عرصہ تک اس علاقہ کا نام مملکتِ ابے ساریز (The Country of Abisares) رہا۔ پروفیسر اور ہیلسٹین کا موقف ہے کہ ایک قدیم سنسکرت مخطوطے میں اس علاقے کا نام یوراسا (Urasa) یا یوراشا (Urasha) بمعنی جھیل آیا ہے (۵)۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد کے زمانے میں دو چینی قبائل ''یوچی'' اور ''ہیونگ'' میں لڑائی چھڑ گئی۔ یوچی قبیلہ ملک چھوڑ کر دریائے جیجون کے کنارے آباد ہو گیا۔ اس قبیلے کے سردار ''کیڈفیسس'' نے کابل اور کشمیر کا علاقہ فتح کرلیا۔ یوچی قبیلہ کو

''کاشائی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اسی نام کی مناسبت سے ہندوستان میں ''کشن خاندان'' کی حکومت قائم ہوئی ۔کیڈفیسس ۸۵ء میں دُنیا سے رُخصت ہوا تو اس کا بیٹا کیڈفیسس ثانی بادشاہ بنا۔اس کی حکومت کا دورانیہ ۳۵ سال پر محیط ہے ۔یہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کا ایک رشتہ دار ''کنشک'' بادشاہ بنا۔۳۲۰ عیسوی تک یہ علاقہ اسی کے زیرِ نگیں رہا۔سمدرگپت ،چندر گپت موریہ کا بیٹا تھا جس نے ایک طویل عرصہ تک ہندوستان بشمول کشمیر و ہزارہ کے علاقے پر حکومت کی (۶)۔سمدر گپت کے بعد چندر گپت ثانی نے ۳۷۵ عیسوی سے ۴۱۳ عیسوی تک اس علاقے پر قابض رہا جس کے بعد کمار گپت بادشاہ بنا جس کی حکومت ۴۵۵ عیسوی تک قائم رہی تاہم آخری چار پانچ سال اس کے لئے انتہائی کٹھن رہا (۷)۔

۴۵۰ عیسوی میں منگولیا سے آنے والی وحشی قوم ''ہن'' نے دُنیا کا امن تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔اس قبیلہ کی ایک شاخ نے اپنے سردار ''اٹیلا'' کی زیرِ سرکردگی مغرب کا رخ کیا اور یورپ میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔دوسری شاخ نے پنجاب کا رخ کیا اور اس پورے خطے میں ظلم و ستم کا لازوال داستانیں رقم کیں۔۴۵۵ عیسوی میں کمار گپت کی موت کے بعد سکندر گپت برسرِ اقتدار آیا۔یہ بھی ہن قوم کے ہاتھوں بے بس ثابت ہوا۔۵۱۲ عیسوی میں ہن سردار ''تورمان'' نے اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ تورمان کے بعد اس کا بیٹا مہرگل بادشاہ بنا لیکن اس خطے میں ظلم و بربیت کا بازار گرم رہا۔ مہرگل ایک بہادر ہندو خاتون ''پدما'' کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا جس کا خاوند مہرگل کے ستم کا شکار ہو چکا تھا اس لئے اس نے مالوہ کے راجہ ''یشو دھران'' سے مل کر مہرگل کی حکومت کا تختہ الٹ دیا (۸)۔

۵۲۸عیسوی میں مہر گل پد ما سے شکست کھا کر کشمیر چلا گیا اور ۵۴۰عیسوی میں وہیں فوت ہو گیا۔یشودھران نے یہ پورا علاقہ پد ما کے حوالے کر دیا ......پد ما نے بھی بھیرہ کو ہی دارالسلطنت بنایا اور ملتان سے لے کر اٹک اور ریاستِ پکھل (کشمیر) سے لیکر دریائے ستلج تک کے وسیع و عریض علاقے کی پہلی بااختیار خاتون حکمران ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔پد ما کی وفات کے بعد ۶۰۶عیسوی تک اس کی اولاد ہی اس علاقے کی حکمران رہی (۹)۔

۶۰۶ء میں دوبارہ طوائف الملو کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے بہت سے تاریخی شواہد اور آثار پردۂ تاریکی میں چلے گئے۔لہٰذا اس دور کے بارے میں ہزارہ کے حالات کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔تاہم یہاں کی تاریخ کے وہ واقعات ہی یقین کے ساتھ بیان کئے جاسکتے ہیں جب بیرونی اقوام نے برصغیر پر حملہ کیا......خاص طور پر جب مسلمان فاتحین برصغیر میں آئے تو تاریخی حقائق کھل کر سامنے آئے کیونکہ مسلمان تاریخ نویسی میں خاص طور پر ماہر تھے۔

ظہورِ اسلام سے ہزارہ کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوا۔اس زمانہ میں اس علاقہ میں لازوال ترقی ہوئی اور یہ علاقہ علم وفن کا گہوارہ بنا۔امن وآشتی کا دور دورہ رہا اور ایک یہ علاقہ ایک عظیم تجارتی گزرگاہ کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ہزارہ اور اس سے ملحقہ علاقوں کی درس گاہوں میں جغرافیہ اور فلسفہ جیسے علوم پڑھائے جانے لگے (۱۰)۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں اسلامی فتوحات کا ایک عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا۔یہ سلسلہ آپؓ کے بعد نہ صرف قائم رہا بلکہ اس میں وسعت بھی آئی۔اسلامی مملکت کی سرحدیں برصغیر، شمالی افریقہ اور یورپ کی مشرقی سرحدات تک پھیل گئیں۔ان دنوں

برِصغیر میں اشاعتِ اسلام کے بڑے مراکز بیرون، منصورہ، بھیرہ، لاہور اور پشاور تھے (۱۱)۔

۶۳۴ عیسوی میں عہدِ فاروقی میں بحرین اور اومان کے گورنر عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ نے بحری قزاقوں کی سرکوبی کے لئے ایک بحری بیڑہ تیار کرایا اور اس سے بمبئی کی سرحدی بندرگاہ ''تھانہ'' پر حملہ کیا۔ ۶۴۵ عیسوی میں بصرہ کے والی عبداللہ بن عامرؓ نے عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کے ذریعے سیستان اور مکران فتح کیے اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ صدائے آذان بلند ہوئی۔ حضرت مہذبؓ نے بنوں اور کابل کے علاقے فتح کئے (۱۲)۔

سندھ کا حکمران ایک برہمن تھا جس کا نام چچ تھا اس نے یہ حکمرانی ایک باوفا عورت سہا دیوی کے ذریعے حاصل کی تھی۔ جس نے بیماری کے زمانہ میں اپنے خاوند ''ساہی'' سے وفا کی تھی۔ چچ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ایرانی بادشاہ یزدگرد کی مدد بھی کی لیکن اس کے باوجود بھی یزدگرد کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ خراساں کی طرف بھاگ نکلا۔ اس شکست کے کچھ عرصہ بعد یزدگرد مع اہلِ خانہ مسلمان ہو گیا۔ سبکتگین اسی کی پانچویں پشت سے پیدا ہوا۔ چچ کی موت کے بعد سندھ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ چچ کا بیٹا راجہ داہر شمالی حصے کا حکمران بنا جبکہ جنوبی حصے پر اس کے بڑے بھائی دہرسیہ نے قبضہ کر لیا۔ راجہ داہر کا پایہ تخت ''اروڑ'' تھا۔ یہ موجودہ روہڑی سے آٹھ میل دُور جنوب مشرق کی طرف تھا۔

۷۱۱ عیسوی میں حجاج بن یوسف نے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو ان بحری قزاقوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا جنھوں نے لنکا سے آنے والے مسلمان عربوں کا ایک جہاز لوٹ لیا تھا اور ان کی خواتین کو یرغمال بنا لیا تھا۔ محمد بن قاسم نے دیبل کی بندرگاہ پر

پہنچ کر مکران، پنج گور، لسبیلہ اور دیبل پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان، بھیرہ، اور جہلم کی پہاڑیوں تک کے تمام علاقے فتح کر لیے۔بدقسمتی سے دنیائے اسلام کا یہ عظیم جرنیل جلد ہی محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر المناک موت سے دوچار ہوا۔محمد بن قاسم نے جانے سے پہلے پنجاب اور سندھ میں حاکم مقرر کئے۔سندھ چونکہ خلافت اسلامیہ کے مرکز سے کافی دُور واقع تھا اس لئے اس میں ضعف اور اِنتشار پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔دسویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں اس اِنتشار نے انقلاب کی صورت اختیار کرلی اور ملتان میں ایک الگ حکومت قائم ہوگئی۔

دسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں غزنویوں نے شمال مغرب سے ہندوستان پر یلغار کی۔۹٦۴عیسوی میں الپتگین غزنی کا حکمران فوت ہوا تو اس کے عہد میں ہندوستان کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔اگر چہ غزنی میں اقتدار کے لئے اکھاڑ پچھاڑ جاری رہی تاہم ۹۷٦عیسوی میں سبکتگین تخت نشین ہوا اور حکومت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی حدود کی طرف توجہ کی(۱۳)۔اس کے مقابلے کے لئے راجہ جے پال (جوان دنوں اس علاقے کا حکمران تھا) نے لشکر جرار تیار کیا تھا۔لمغان کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور مصالحت پر لڑائی ختم ہوگئی۔جے پال نے پھر سرتابی کی اور ہند کے دیگر راجوں کی مدد سے لڑائی کے لئے لشکر تیار کیا۔اس مرتبہ سبکتگین نے اسے شکست فاش دی اور لمغان سے حدودِ پشاور بشمول دریائے نیل آب (اٹک) کے اِس پار تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔

سبکتگین کے انتقال کے بعد ۹۹۸عیسوی میں اس کا جانشین محمود تخت آرائے غزنی ہوا۔۹۹۹عیسوی میں اسے خلیفۂ بغداد کی طرف سے خلعت اور ''امین السلطنت

یمین الدولۃ'' کا خطاب ملا۔۱۰۰۱عیسوی میں محمود برصغیر کی حدود میں پشاور کے راستے داخل ہوا اور اس نے ہندو راجوں کے خلاف مسلسل کئی جنگیں لڑیں (۱۴)۔دریائے نیل آب (اٹک) سے لے کر دریائے وہب (جہلم) اور سیالکوٹ سے ملحقہ حدودِ کشمیر تک کے علاقوں میں اپنے حاکم اور قاضی مقرر کئے۔ہزارہ کی حدود اس وقت تک مملکتِ بگل (پکھل) اور دریائے کنار (کنہار) تک پھیل چکی تھیں تاہم درمیان میں دریائے نیل آب سے ملحقہ کچھ علاقے پٹھانوں کے زیر قبضہ تھے (۱۵)۔

۱۰۲۲ عیسوی تک محمود غزنوی نے پنجاب کو سلطنت غزنی کے ساتھ با قاعدہ ملحق کر لیا تھا اور ان یہ سارا علاقہ بلا واسطہ اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا اور شمالی ہند میں پشاور اور لاہور نے اسلامی مراکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ان شہروں کو علماء صوفیا اور مبلغین نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔نیز ملازمتوں اور جاگیروں کے حصول کی خاطر قبیلوں کے قبیلے غزنی، کابل اور بلخ وغیرہ سے منتقل ہو کر موجودہ خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں آباد ہونے لگے جس کی بدولت یہ علاقہ اسلامی ثقافت اور اسلامی علوم وفنون سے روشناس ہونے لگا تھا۔دینی علوم اور عربی زبان سے اس علاقے کا یہ دوسرا رابطہ تھا جو ماورالنہر اور غزنی کے راستہ سے قائم ہوا۔یہ رابطہ بعد میں اس قدر اہمیت اختیار کر گیا کہ اس علاقہ کو عراق وشام کی وراثت اور ہمسری زیب دیتی تھی۔

سلطان محمود خود بڑا علم دوست انسان تھا۔سلجوقی اور غوری دور کی تصانیف میں محمود کی علم پروری اور عدل و انصاف پسندی کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔وہ مذہباً سنی العقیدہ مسلمان تھا۔اولیاء اور صوفیاء کے ساتھ ساتھ اہلِ علم کا بڑا ادب کرتا تھا اور علم پھیلانے میں کوشاں رہتا تھا۔ابوریحان البیرونی جیسا عالم اسی کے زیرِ سایہ تحقیق و

جستجوئے علمی کے لئے آفاق میں گھومتا رہا۔ ان نے نندنہ (جہلم) میں بیٹھ کر زمین کا قطر معلوم کیا۔ ابوالفضل بیہقی، ابونصر عتبی اور گردیزی جیسے مورخ اس کے منشی اور سیکرٹری تھے۔ شمس الکفاۃ احمد بن حسن المیمندی جیسے نابغوں کو اس کی وزارت کا شرف حاصل رہا(۱۶)۔

محمود غزنوی کی آمد سے ہزارہ میں ایک نئی تہذیب ابھری جسے بہر نوع اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ بدھ مت کا نشان تو صدیوں پہلے سفید ہن اور مقامی کو جڑ مٹا چکے تھے تاہم برہمنی اقتدار کے سائے میں ہندو مت اپنی رنگا رنگ روایات سمیت موجود تھا۔ انہی میں سے لوگ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرنے لگے۔

۱۰۳۰ عیسوی میں سلطان محمود کا انتقال ہوا تو سلطان مسعود مسند آرائے سلطنت ہوا۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح بڑا علم دوست اور عالم نواز شخص تھا اور خود بھی اعلیٰ درجے کا مصنف تھا۔ اس طرح یہ سیاسی خاندان علم پروری بھی کرتا رہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں عام طور پر اور پنجاب بشمول ہزارہ میں خاص طور پر علمی فضا پیدا ہو گئی۔ ان کے علم دوست روّیہ سے ہزارہ میں مسلم آبادی بڑھتی رہی۔ نیز اس کے بعد عہدِ غلاماں میں ہلاکو خان اور چنگیز خان کی تاخت و تاراج کی وجہ سے لوگ ایران، کابل، خوارزم، غور، خیوا، کاشغر وغیرہ سے جان بچا کر بھاگے اور برصغیر کے ان علاقوں میں آ کر بس گئے جنہیں اِس وقت "ہزارہ" کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس تاریخی خطہ میں اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان راسخ ہو گئی۔

محمود کے بعد سب ممالکِ مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے لیکن ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ رہا اور دو سو برس کے قریب خاندانِ غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی

جن کادارالحکومت لاہور ہی رہا۔مختلف اقوام وممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہلِ ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت، لین دین، شادی بیاہ، ہر قسم کے تعلقات پیدا کیے۔اسی دور میں حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ اور ابو ریحان البیرونی پنجاب میں جلوہ افروز ہوئے۔

شمال اور سندھ سے مسلمانوں کی آمد، جدید استعماری اصلاح میں کسی نو عالمی منصوبے کا نتیجہ نہ تھا کیونکہ مستقل بنیادوں پر ریاستی ادارے قائم ہوئے اور نہ ہی کوئی مرکزی اتھارٹی ہی منضبط ہوسکی۔ہندوستان میں مسلمانوں کی پائدار حکومت کا اصل آغاز اس وقت ہوا جب شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے ایک ممتاز حکمران پرتھوی راج کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔شہاب الدین غوری کے عہد میں بھی ہزارہ کے زیریں علاقے پنجاب (دہلی) کے ماتحت تھے۔اس کے بعد سلسلہ چلتا رہا اور شمال سے آنے والے حملہ آور یکے بعد دیگرے قابض خاندانوں کو کچلتے اور replace کرتے رہے۔ ان میں غوری، غلاماں، خلجی، تغلق، سادات اور لودھی خاندان شامل ہیں۔سلطنتِ دہلی کا آخری خاندان مغلیہ تھا جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک حکمران رہا۔

ہندوستان میں مغل سلطنت واحدانیت، مرکزیت اور لاتعصبیت کے اعتبار سے برصغیر کی سب سے بڑی اور پہلی حکومت تھی۔مغلوں نے تہذیب وثقافت، علم وادب اور تعمیرات وترقی کے لئے بڑے اہم اور دُور رس اقدامات کئے۔شاندار قلعے، عظیم الشان مساجد ومقابر اور عالی شان باغات ومحلات تعمیر کرائے۔علماء، شعرا، صوفیاء اور مورخین کی حوصلہ افزائی کی گئی۔اہلِ ہنر اور اہلِ فن قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔گو عام تعلیم ریاستی فرائض میں شامل نہ تھی تاہم سرکاری اوقاف، وظائف اور مراعات کے

ذریعے تعلیمی اور علمی اداروں کی سرپرستی ہوئی، اساتذہ اور طلباء کو امداد ملی۔ مغل بادشاہوں اوران کے عہد کے صوفیاء نے وسیع المشربی اور بے تعصبی سے جہاں ایک طرف برصغیر کے تمام مذاہب کو ہندوستانی لڑی میں پرو دیا وہاں رواداری، بھائی چارے اور برداشت کے جذبہ کو بھی فروغ ملا۔ جس کا بھیانک نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مسلم تشخص اور شریعت کے خدوخال بری طرح مجروح ہوئے البتہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں غیر اسلامی رسم و رواج کی حوصلہ شکنی کی گئی اور شعروادب، موسیقی و مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گئے۔

فن کا مقصد محض حظ و مسرت نہیں بلکہ تسخیر ہے۔ اسلام نے جس طرح زندگی کا تصور بدل دیا، اس طرح فن کا تصور بھی بدل دیا۔ مسلمانوں کے نزدیک فن نقل نہیں بلکہ مطلق عمل ہے۔ مسلمانوں نے نزدیک فن کمال کا ایک شعبہ ہے۔ اس عہد میں بعض فنون کو قابلِ ذکر ترقی نہ کر سکے کیونکہ دُنیا کی ہر تہذیب ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا خاص مزاج، ذوق کے بعض میلانات کا تو طالب ہوتا ہے لیکن بعض سے بیزار اور یہ سب کچھ اس تہذیب کے مخصوص عقائد کی اتباع کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بعض تہذیبوں مثلاً ہندوا اور بدھ مت میں بت تراشی اور مجسمہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن رومیوں اور اسلامی تہذیب نے فنِ تعمیر کو زیادہ اہمیت دی۔ مسلمانوں نے خاص طور پر جن پانچ فنون میں اپنے فنی کمالات دکھائے ان میں فنِ تعمیر، فن نقاشی اور فنونِ آرائشِ کتاب و تعمیرات، فنِ خطاطی، شاعری اور موسیقی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ اسلامی آرٹ یا فن بہت سی تہذیبی وراثتوں کے میل میلاپ سے وجود میں آیا۔ اس میں یونانی، ایرانی، عراقی اور ترک تہذیبوں کے تمام فکری و فنی دھارے

اور رجحانات شامل ہیں۔اس پسِ منظر میں مغل عہد میں فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار تہذیبی وثقافتی گوشے از خود بے نقاب ہوتے جائیں گے۔مغلوں کے دورِ حکومت میں فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری، سنگ تراشی، شاعری،موسیقی، رقص اور معمار سازی وغیرہ میں بے پناہ ترقی ہوئی۔

مغل عہد میں لاہور اور دہلی پایہ تخت رہے اور سیاسی وثقافتی سرگرمیوں کے مراکز بھی یہی مرکزی شہر تھے۔مغلوں کے عہد میں کشمیر بھی ان کے زیرِ نگیں آچکا تھا اس لئے مغل بادشاہ،شہزادے اور شہزادیاں سیر سپاٹے اور یہاں کے حکام سے سرکاری ونجی ملاقاتوں کے لئے اکثر مظفر آباد اور سری نگر کے لئے آتے رہے اور ان کے قافلے حسن ابدال، سرائے صالح، دھمتوڑ، مانگل اور مانسہرہ کی شاہراہ کو بطور گزرگاہ استعمال کرتے تھے۔ ہزارہ چونکہ ان کی عملداری میں بھی آتا تھا اس لئے بھی وہ اس علاقے میں ورود کرتے رہے۔

مغلوں کے عہد میں سرکاری ملازمتوں، تعلیم اور فنون کی تحصیل کے لئے بھی یہاں سے بے شمار لوگ لاہور اور دہلی کا رخ کرتے ...... جو اپنے اپنے دائرہ کار میں ترقی بھی کرتے رہے اور ناموری بھی حاصل کی۔اگر ہم فنِ مصوری کو لیں تو برتنوں پر چینی نقش کاری کے فن میں خانپور سے ملحقہ گاؤں بھیر کنڈ سے ایک ماہر فن قاضی غلام رسول، جہانگیر کے عہد میں دہلی پہنچا اور اس نے ظروف سازی اور نقش کاری میں ایک نام پیدا کیا۔اس کے بنائے ہوئے فن پاروں میں سے ایک صراحی، ایک شکستہ پیالہ اور ایک گلدان آج بھی اسٹیٹ میوزیم آگرہ کی زینت ہے جن پر مور، ہرن اور مینا کی تصاویر منقش ہیں (۱۷)۔اسی طرح فنِ خطاطی میں اکبر کے عہد میں فارسی زبان میں ''انوار

سہلی'' کا ایک مخطوطہ مصور کیا گیا جس کو چار مختلف اشخاص نے مختلف حصوں میں بانٹ کر مکمل کیا......ان اشخاص میں مُلا میر نادر بخش کشمیری المعروف مُلا نادر بھی شامل تھا جس کا آبائی تعلق ہریپور کے مضافاتی تعلقہ (گاؤں) چھپار (یا چھاڑ) سے تھا (۱۸)۔انوار سہلی کا یہ مصور مخطوطہ لندن سکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں موجود ہے اور اس پر ۹۷۸ ہجری/۱۰۷۵ عیسوی کی تاریخ درج ہے (۱۹)۔

مغلیہ عہد میں فنِ موسیقی کو بھی بہت عروج حاصل ہوا۔شہنشاہ بابر نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔نصیر الدین ہمایوں بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا دلدادہ اور شوقین تھا جس کے عہد میں موسیقی دان اور مغنی ''اہلِ مراد'' میں شامل تھے۔اس کے دربار میں میر عبداللہ قانونی، مولانا حاتم قانونی، استاد شاہ محمد سربابی، حافظ دوست محمد مغنی اور استاد یوسف جیسے ماہرِ فن موجود تھے۔ان اصحاب میں سے حافظ دوست محمد مغنی کا تعلق مملکتِ ہزارہ (پنجاب) سے تھا جو بطور معلم تلاشِ روزگار میں ہمایوں کے دربار میں پہنچا تھا اور اپنی خوش الحانی اور موسیقی سے شغف کی بدولت رُباب بجا کر گایا کرتا تھا (۲۰)۔

اکبر بادشاہ کے عہد میں موسیقی ماضی کے زمانہ سے سبقت لے گئی بلکہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔اس کے موسیقار سات طائفوں میں منقسم تھے اور ہر طائفے کے لئے گانے بجانے کے لئے ایک دن مقرر تھا۔اورنگزیب کے عہد میں گو کہ موسیقی کا عمل ممنوع تھا لیکن موسیقی کے علم وفن پر اُسی کے دور میں کتب تصنیف ہوئیں۔اسی کے عہد میں مملکتِ بنگلی (پکھلی) کے ایک عالم مُلا محمد شاہ نے فنِ موسیقی کے بارے میں فارسی زبان میں ایک تنقیدی رسالہ ''رد رسالہ در عمل بین دھاٹھ راگ'' لکھا جو محمد کامل خانی کی کتاب ''رسالہ در عمل بین دھاٹھ راگ'' پر اور شاید اس فن پر پہلا تنقیدی رسالہ تھا۔اس

رسالے کا ۱۴۳ صفحات پر مشتمل شکستہ مخطوطہ "مکتبہ معصومیہ استنبول (ترکی)" کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس رسالے کے ہر صفحے پر بارہ بارہ سطریں ہیں لیکن آخری صفحے پر ۹ سطریں اور کتابت کا سن (۱۰۷۸ ہجری) درج ہے (۲۱)۔

۱۷۰۷ عیسوی میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات سے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی اور سقوطِ دہلی تک مغل تاریخ مسلسل ناکامیوں، محرومیوں اور ٹوٹ پھوٹ کی داستان ہے۔ جس کے الم ناک پہلوؤں میں مرکز گریز قوتوں کا طاقت پکڑنا، مرکزی قیادت میں سازشوں کے جال اور اس کا کمزور پڑنا، علاقائی اور مذہبی تعصبات کا بڑھنا، عام مسلمانوں کو مذہب سے دور رہنا اور غیر ملکی طاقتوں کا عروج پکڑنا شامل ہیں۔ ان طاقتوں میں راجپوت، مرہٹے، سکھ اور یورپی اقوام شامل ہیں۔ چنانچہ داخلی اور خارجی عوامل کے تحت اورنگ زیب کی وفات کے پچاس برس بعد ہی عظیم مغل سلطنت پاش پاش ہوگئی۔ اس سانحہ عظیم کی وجوہات اور اثرات میں ایک مسلم تشخص اور دوسرا مختلف مذاہب و فرق کی باہم رواداری کم ہونا ہے۔ پہلی کا آغاز اکبر اعظم سے ہوا اور سرکار دوبار میں غیر مسلم اثر و نفوذ نقصان دہ ثابت ہوا۔ دوسرا عہدِ عالمگیری میں انتہا کو پہنچا۔ نظامِ حکومت عام آدمی کی حالت بہتر بنانے، فروغ علم کرنے اور جدید علوم و فنون کو ڈھونڈنے اور پھیلانے میں ناکام رہا۔ اس انحطاط کے دور کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات سر زمینِ ہزارہ میں بھی نہ صرف محسوس کئے گئے بلکہ مقامی خوانین اور راجاؤں نے بھی مرکز سے بغاوت شروع کر دی...... چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے سرداروں اور اس علاقہ کے با اثر اور طاقتور خوانین نے اپنی اپنی حدود میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔

جب اٹھارویں صدی میں دہلی کی مرکزی حکومت اور مغل قیادت کمزور پڑ گئی تو

پنجاب میں سکھ ایک مضبوط فوجی طاقت کی حیثیت سے اُبھرے۔ میدان خالی پا کر سکھ جتھے گاہ بہ گاہ نکلتے اور وسیع مسلم علاقوں کو تاخت و تاراج کر دیتے۔ جہاں کہیں ان کا مقابلہ کیا جاتا وہاں جنگلوں اور ویرانوں میں غائب ہو جاتے۔ ان کے دَل جتھوں پر مشتمل تھے اور ہر جتھے میں بارہ مسلیں ہوتی تھیں۔ پنجاب کے مسلمانوں اور ان کے علمی و تہذیبی اثاثوں کے لئے سکھوں کی یورشیں شدید تباہی، اذیت اور ابتلا کا باعث تھیں۔ پورے صوبے میں بدنظمی، لاقانونیت اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔

آغاز میں سکھ محض مذہبی گروہ تھے پھر انہوں نے سیاسی جتھہ بندی کر کے مغلوں کے اخیر عہد میں مرہٹوں کی طرح لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ عیسوی کو ہندوستان پہنچا۔ ہزارہ کے جیالے غازیوں کے دستے بھی ابدالی لشکر کے ساتھ محاذ پر روانہ ہوئے۔ مرہٹوں کا سردار تاجی ۸۰ ہزار سپاہیوں کا لشکر جرار لے کر مقابلے کی خاطر نکلا۔ سرہند کے قریب مرہٹوں کو پہلی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہلکر مُلہار راؤ مزید کمک لے کر پہنچ گیا اور پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی معرکہ ہوا جب ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹوں کو عبرت ناک شکست کھا کر منتشر ہونا پڑا۔ مگر افسوس احمد شاہ ابدالی کا پھیرا ساون کا بادل تھا، گرجا، برسا اور نکل گیا۔ اسے واپس جانے کی بہت عجلت تھی۔ تاریخ کا یہی وہ لمحہ ہے جس کے بعد سکھوں نے بڑے زور کی اڑان بھری اور پنجاب بھر میں جگہ جگہ جتھہ بازی اور قلعے تعمیر کر کے مسلمانوں کے خلاف مضبوط محاذ قائم کر لیا۔

۱۷۶۴ء میں احمد شاہ ابدالی کو سکھوں کی شوریدہ سری سے نمٹنے کا خیال آیا۔ وہ دوبارہ ہزارہ کے جیالے دستوں کی اعانت سے لاہور کی جانب بڑھا اور لدھیانہ کے

قریب معرکہ کارزار برپا کیا جس میں بیس ہزار کے قریب سکھ واصلِ جہنم ہوئے۔احمد شاہ ابدالی کو اب بھی واپسی کی عجلت تھی اس نے ایک ہندو کابلی مَل کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور واپس ہو گیا......اُدھر احمد شاہ ابدالی نے جیسے ہی دریائے اٹک عبور کیا اِدھر سکھ جتھوں نے کابلی مل کو چلتا کیا اور اپنے اقتدار کا اعلان کر کے چناب سے ہانسی تک کا علاقہ آپس میں بانٹ لیا۔

اس زمانے میں اٹک سے چناب تک کا علاقہ گکھڑوں کے زیرِ نگیں تھا۔ گکھڑوں کے سردار مقرب خان نے احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں اس کا ساتھ دیا تھا لہٰذا اس نے دریائے اٹک سے دریائے چناب کے مابین علاقہ پر اس کے تسلط کی توثیق کر دی۔سکھوں کے پنجاب پر تسلط کے بعد حالات اتنے بدترین ہو گئے تھے کہ مساجد، مدارس اور مقابر تک کو نہ چھوڑا گیا۔کتب خانے اور مکاتب جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ مساجد اصطبل میں تبدیل کر دی گئیں یا کھنڈروں کا ڈھیر بنا دی گئیں۔مساجد میں اذان ممنوع قرار دے دی گئی۔طویل طوائف الملوکی اور شدید بدامنی کا دور دورہ تھا۔ سکھوں نے اپنی کاروائیوں کا دائرہ کار چناب سے اٹک تک کے علاقے میں بڑھایا اور پوٹھوہار کے علاقے میں شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔ان کی سرکوبی کے لئے ۲۷ نومبر ۱۷۹۸ء کو احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان حملہ آور ہوا اور جلد ہی واپس پلٹ گیا۔واپسی پر دریائے جہلم کو عبور کرتے ہوئے اس کی بارہ توپیں غرقاب ہو گئیں۔رنجیت سنگھ نے ان میں سے آٹھ نکلوا کر شاہ زمان کو پشاور بھجیں اور صلے میں لاہور کی حاکمیت کا پروانہ حاصل کر لیا۔بھرپور مار دھاڑ کے بعد ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور فتح کر لیا اور سکھا شاہی دور شروع ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں کشمیر فتح کیا تو قلعہ اٹک بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ بھائی حکم سنگھ چمنی کو چھچھ ہزارہ (ان دنوں یہی اس علاقے کا نام تھا اور چھچھ، اٹک، حسن ابدال وغیرہ اس کی حدود میں شامل تھے) کا حاکم مقرر کیا گیا جس نے محاصل کی وصولی کے مکھن سنگھ کو بھیجا جو سرائے صالح میں آ کر مقیم ہوا۔ اس سے پہلے راولپنڈی کے راجے یہ مالیہ وصول کرتے تھے جو بارہ ہزار سالانہ فی ڈھیری مقرر تھا۔ مکھن سنگھ نے محمد خان ترین جو اس علاقے کا اہم ترین سردار تھا کے پاس اپنا رقعہ دے کر ایک بندہ بھیجا تو محمد خان ترین نے بڑے سخت الفاظ میں جواب دیا۔ جس کے نتیجے میں دریائے دوڑ کے کنارے پہلی باقاعدہ جھڑپ ہوئی جس میں مکھن سنگھ مارا گیا۔

حکم سنگھ کو خبر ملی تو وہ اٹک سے کچھ سپاہی لے کر محمد خان ترین کی سرکوبی کے لئے پہنچا لیکن سلطان پور کے نزدیک پہنچ کر اور محمد خان ترین کی حربی طاقت کو دیکھ کر وہ بھی ہمت ہار بیٹھا۔ لہٰذا اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خط لکھ کر تمام حالات سے آگاہ کیا۔ جس نے دیوان رام دیال کو فوج اور توپ خانہ کے ساتھ بھیجا۔ کچھ لوگ اس کا بھاری لشکر دیکھ کر مطیع ہو گئے لیکن سید خانیوں، سری کوٹ کے مشوانیوں اور تربیلہ کے پٹھانوں اور یوسف زئیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں دیوان رام دیال بھی مارا گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو جب اس کی خبر پہنچی تو اس نے ایک اور بہادر سردار امر سنگھ کو ہزارہ کے انتظام کے لئے بھیجا جو ۱۸۲۱ء میں ہزارہ میں داخل ہوا۔ کوٹ نجیب اللہ کو اس نے اپنے پہلے پڑاؤ کے طور پر منتخب کیا۔ امر سنگھ نے ایک سو پچاس لوگوں کے ساتھ خان پور کے راجہ پر حملہ کر دیا۔ کچھ علاقے میں خونریزی ہوئی لیکن وہ بھی مارا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک بڑی فوج مائی سدا کور اور کنور شیر سنگھ کی سرکردگی میں مع توپ خانہ

بھیجی۔ جس کے سامنے محمد خان ترین نے اطاعت قبول کر لی اور خراج میں کچھ گھوڑے، باز اور مقرر شدہ روپیہ ادا کر دیا۔

سردار ہری سنگھ نلوہ ان دنوں حاکم کشمیر مقرر تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے انتہائی عجلت میں لاہور پہنچنے کا حکم دیا۔ جب ہری سنگھ پکھلی میں وارد ہوا تو ہزارہ کے افغانوں، جدونوں اور تنولیوں نے محمد خان ترین کے ساتھ مل کر موضع مانگل میں سردار ہری سنگھ راستہ روک لیا۔ افغان اس سردار سے پشمینہ کا محصول اور گزرگاہ کا حقِ بدلہ لینا چاہتے تھے۔ کچھ روز تک صلح اور راستہ دینے کی بات چلتی رہی مگر ناکام رہی۔ آخر کار مانگل کے مقام پر ایک بار پھر خونریز معرکہ ہوا جس میں افغانوں کو شکست ہوئی۔

اس موقع پر جدونوں نے سردار کے سامنے یہ تجویز رکھی کی ہم نواں شہر، دھموڑ اور رجوعیہ سے بطور تاوان ہر گھر سے ساڑھے پانچ روپے وصول کر کے بطور ہرجانہ پیش کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں اپنے روزمرہ کے معمولاتِ کاشتکاری وغیرہ سے نہ روکا جائے۔ سردار ہری سنگھ نے چند روز نواں شہر میں قیام کیا اور لاہور روانہ ہو گیا۔ ہری سنگھ نے کشمیر اور ہزارہ سے بے شمار تحفے از قسم گھوڑے، کپڑے اور نقدی رنجیت سنگھ کے دربار میں اسے پیش کیے تو اس نے مانگل کی فتح کی خوشی میں اُس کا تمام حساب کتاب ختم کر دیا۔ ہری سنگھ کچھ روز لاہور میں قیام کے بعد حاکم ہزارہ مقرر ہوا اور وہ پشاور کی طرف روانہ ہوا تا کہ ہزارہ اور اس علاقے کا معاملہ اکٹھا کرے۔ مہاراجہ چونکہ محمد خان ترین کی عزت کرتا تھا لہٰذا اس نے ہری سنگھ کو بھی نرمی برتنے کا کہا لیکن محمد خان ترین اسے کسی خاطر میں نہ لایا یوں اختلافات بڑھتے رہے۔ ہری سنگھ جب یہاں پہنچا تو اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور سری کوٹ کے مقام دونوں فریقین کے مابین جنگ

ہوئی جس میں ہری سنگھ کوشکست ہوئی۔ہری سنگھ نے ہری پور کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایااوراپنی افواج کا قلعے کے اندر رہنے کابندوبست کیا۔ہری سنگھ دوبارہ جب ہزارہ میں وارد ہواتو بھی اسے خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ہزارہ کے عوام نے کھل کر سکھوں کامقابلہ کیااورانہیں تقریباًتمام علاقوں میں الجھائے رکھا تاہم سکھوں نے جہاں بھی موقع ملاظلم وبربریت کابازارگرم رکھااورمسلمانوں کی املاک کوجلاتے رہےاورمعصوم لوگوں کوتہ تیغ کرتے رہے۔

ہری سنگھ نلوہ نے علاقے میں مظالم کابازارگرم کررکھاتھا کہ اسی دوران ۱۸۲۱ء میں شہید سید احمد بریلویؒ اوران کے جاں نثاررفقاء نے سکھوں کے مظالم کےخلاف دہلی کی فتح پوری مسجد میں جہاد کی تحریک کے مبادیات طے کئےاورایک طویل دورے کے بعدا کوڑہ خٹک کےقریب سکھوں سے جہادشروع کردیا۔۱۸۲۶ء میں ان مجاہدین نے پشاور، ریاست امب، دربنداوراپرہزارہ کے بیشتر علاقے سکھوں سے آزادکرالئےلیکن مالی وسائل کی کمی اوربعض مقامی سرداروں کی مخالفت اوراندرونی سازشوں کی وجہ سے یہ جنگی معرکہ نتیجہ خیزثابت نہ ہوا۔۶ مئی ۱۸۳۱ءکوبالاکوٹ کے مقام پرسیداحمد شہیدؒ اورشاہ اسمٰعیل شہیدؒ اپنے بعض اہم رفقاء کے ساتھ آخری معرکہ سرانجام دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئےتوبچی جمعیت علاقہ غیر میں ستھانہ چلی گئی جہاں ان مجاہدین نے ایک طویل مدت تک قیام کیااورحربی وتبلیغی مساعی جاری رکھی۔

سکھوں کی اپنی ایک معاشرت تھی وہ ہندوؤں میں شامل تھےاوران سے باہر بھی تھے۔ان کالباس ہندوؤں سے یکسرمختلف تھیں۔علانیہ جھٹکا کھاتےاورشراب پی کر غل غپاڑہ کرتے۔ان کےمعبدبت کدےنہیں تھے بلکہ وہاں گرنتھ صاحب پڑھاجاتااور

باجے گاجے کے ساتھ چند رسومات ادا کی جاتیں۔کڑاہ پرشاد ان رسومات اور پوجا پاٹ کا شیریں تتمہ ہوا کرتا۔سکھوں کو مسلمان درویشوں سے بہت عقیدت تھی۔خود گورونانک کو بھی حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے فیضان پہنچا تھا۔

سکھوں نے اپنے عہد میں جو عمارتیں بنوائیں ان میں رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔اب بھی ہری پور اور مانسہرہ کے قدیمی علاقوں میں چھوٹی اینٹ (جسے عرفِ عام میں رنجیت شاہی اینٹ کہا جاتا ہے) کے تعمیر کردہ مکانات موجود ہیں وہ سکھوں کے عہد کی یاد دلاتے ہیں(۴۲)۔

۱۸۴۹ء میں انگریزوں کا پنجاب پر مکمل کنٹرول ہو گیا اور حکومت براہ راست برطانوی تسلط میں آ گئی۔لہٰذا انگریزوں نے پشاور اور کابل کی طرف کئی بار چڑھائی کی کوششیں کیں اور پسپائی بھی اختیار کی۔تاہم اس علاقے پر ان کا چونکہ تسلط قائم تھا اور ہری پور، ایبٹ آباد اور مانسہرہ وغیرہ کے علاقے ان کے مطیع و فرمان بردار ہو چکے تھے اس لئے یہاں کے سرداروں اور عوام نے ان کا بھرپور ساتھ دیا...... اِکا دُکا سردار باغی بھی رہے لیکن زیادہ تر لوگوں نے جاگیریں اور اعزازیے وصول کر کے انگریز کے اقتدار کو دوام بخشنے پر ہی اپنی توانائیاں صرف کیں۔جس کا ثبوت مجاہدین آزادی اور شہدائے بالاکوٹ کی معاصر تواریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔انگریزوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے کے لئے اس علاقے میں فوجی چوکیاں قائم کیں جہاں سے ان کے حکام حکومت کے معاملات چلاتے رہے۔

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف پنجاب اور بالخصوص ہزارہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران جس کردار کا مظاہرہ ہوا تھا کتبِ تاریخ میں اس

کا احوال کم کم ہی ملتا ہے۔تاہم کسی بھی پیمانے پر ہو جریتِ آزادی کی شمع نے اپنی روشنی پھیلانے میں کسر نہیں چھوڑی۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جب میرٹھ سے جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو اس کی بازگشت ہر طرف سنی جانے لگی۔ پنجاب میں لدھیانہ، ہوشیارپور، امرتسر، لاہور، راولپنڈی اور ہزارہ تک اس آگ کے شعلے پہنچے۔انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔برطانوی افواج میں شامل دیسی سپاہیوں اور افسران کو حفاظتِ خود اختیاری اور خطرہ بغاوت کے پیشِ نظر گرفتار اور نظر بند کیا جانے لگا۔مری علاقے میں متعین انگریز افواج کا گرمائی مستقر تھا جہاں متعین یونٹوں کے اندر شاید ہی کوئی دیسی سپاہی ہو لہٰذا وہاں زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت محسوس نہ کی گئی مگر علاقے کی زخم خوردہ سویلین آبادی نے ہتھیار اٹھا لئے ان کی مدد کے لئے ہزارہ کے کرال قبیلہ سے تین سو مجاہدین کا دستہ روانہ کیا گیا۔دفترِ خزانہ کو لوٹا گیا اور کمشنر کے بنگلے کو آگ لگا دی گئی۔مجاہدین آگے بڑھ رہے تھے کہ مال روڈ کی طرف گھات لگائے فوجیوں نے فائر کھول دیا، بہت سے مجاہد شہید ہوئے اور باقیوں کو گرفتار کر کے صبح فٹ بال گراونڈ میں ان سب کو توپ دم کر دیا گیا۔انگریز اپنے انداز میں یہاں کے عوام و خواص کے ساتھ برتاؤ جاری رکھے رہے...... کہیں فوج کشی اور کہیں لالچ ...... کہیں نرم روی اور کہیں دبدبہ کے ذریعے انہوں نے علاقے میں اپنے قدم جمائے رکھے...... انگریزی افسر شاہی، رکھ رکھاؤ اور طرزِ معاشرت کا یہاں کے لوگوں پر دوسرے ہندوستانی علاقوں کی بہ نسبت کچھ خاص اثر نہ ہوا جس کی بنیادی وجہ یہاں کے لوگوں کی اپنی ثقافتی اور تہذیبی روایات کی مضبوطی اور اسلامی طرزِ معاشرت پر سختی سے عملدرآمد ہے۔

۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے اٹھنے والی آواز کو کہ انگریز حاکم نے اپنے اسلحے اور عسکری قوت کے زور پر وقتی طور پر دبا بھی دی تھی لیکن اس ناکام جنگِ آزادی کے بعد جو سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی بحران پیدا ہو گیا تھا اس صورتِ حال کو معمول پر لانے کے لئے ہندو مسلم دونوں فرقوں کے پیشواؤں نے اصلاحی اور مذہبی تحریکیں چھیڑ دیں۔ان مذہبی اور اصلاحی تحریکوں میں بھی ہزارہ کے عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پورے ہندوستان میں یہاں نے عوام کی نمائندگی کی۔

میجر ایبٹ ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا جو یہاں کی تہذیب و ثقافت اور عوام میں گھل مل کر رہا اور علاقے میں خاص مقبول بھی رہا۔اس کے دور میں یہاں کے عوام نے اس کا ساتھ بھی دیا اور اس کی حفاظت بھی کی لیکن اس کے پیشِ نظر ہمیشہ برطانوی حکومت کے اہداف ہی رہے......ہزارہ کے بیشتر مؤرخین نے نجانے کیسے اسے دیوتا سمجھا......یا بنایا کیونکہ میجر ایبٹ نے یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی ایسا قابلِ ذکر کام نہیں کیا جو بطور مثال پیش کیا جا سکے البتہ اس نے ان خوانین اور سرداروں کو خوب نوازا جو اپنی رعایا اور قوت کے ساتھ اس کے مفادات کو تحفظ فراہم کرتے رہے۔یہاں کے غیور اور حریت پسند لوگ ہمیشہ اس کے خلاف برسرِ پیکار رہے......بارہا ہزیمتیں اٹھائیں، جلاوطن ہوئے، توپ دم کئے گئے اور ان کی املاک، گھر بار، مال و متاع سب کچھ لوٹ لیا گیا......پھر بھی وہ سکھوں اور انگریزوں سے لڑتے رہے......تاریخ کے صفحات میں ایسے غیور لوگوں کی داستانیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے جس کا معاصر تاریخ میں تذکرہ کم کم ملتا ہے۔نجانے کیوں؟

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کے مبارک دن کا سورج یہاں کے مسلمانوں کے لئے

بھی ایک نئے عہد کی نوید بن کر طلوع ہوا اور دُنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی ریاست کا پاکستان کے نام سے اضافہ ہوگیا...... ہزارہ کے غیور عوام اور اولوالعزم مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ غیر ملکی استعماری قوتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزادی مل گئی۔

حواشی وماخذات

۱۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول۔ص ۸۹، ۹۷، ۲۵۴

۲۔ سکندر اعظم از ہیر الڈلیم: ص ۱۸۴

۳۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول۔ص ۸۹، ۹۷، ۲۲۵، ۲۵۴

۴۔ امپیریل گزیٹر آف انڈیا...... پراونشل سیریز پنجاب جلد دوم ص ۱۲۷

۵۔ سکندر اعظم از ہیر الڈلیم: ص ۳۴۴

۶۔ آرمین انڈیکا، ص ۴۴-۱۴۳

۷۔ ایضاً ص ۵۰-۱۴۹

۸۔ تاریخ ہند از سید عبدالقادر جلد اول، ص ۱۰۰-۹۹

۹۔ تاریخ ہند از سید عبدالقادر جلد اول، ص ۱۱۲

۱۰۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء ص ۴۶

۱۱۔ تاریخ بھیرہ، ص ۱۳۲

۱۲۔ ایضاً ص ۱۵۷

۱۳۔ فقی، تاریخ سیفی، مطبع نامی پریس، سن ندارد، ص ۱۲، ۱۷، ۳۵

۱۴۔ فقی، تاریخ سیفی، مطبع نامی پریس، سن ندارد، ص ۱۳۳

۱۵۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد دوم ص ۹۹، ۱۸۷، ۲۳۴

۱۶۔ استاد خلیلی، سلطنت غزنویاں، ص ۲۸۴-۲۸۶

۱۷۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء

ص۲۱۴

۱۸؎ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد دوم۔حاشیہ ص۱۴۵

۱۹؎ آرینن انڈیکا،ص۱۴۴

۲۰؎ ڈاکٹر فخر الدین محمد:ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ،اسٹیم پریس ایسٹ بنگال، ۱۹۴۶ء،ص۲۲۳تا۲۲۴

۲۱؎ استاد بہرام فیروز زر کمانی:فہرست مخطوطاتِ خطی درعلم وفن موسیقی،استنبول (ترکی)،سن ندارد، ص۱۷۶

۲۲؎ سردار کرنیل سنگھ ڈھلوں: مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی عمارتیں:مضمون مشمولہ ’’...ہفت روزہ ’’آغاز‘‘ لاہور،شمارہ۲:جلد۱،بابت مارچ۱۹۶۱ء،ص۲۲ ۔

باب: دوم

ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کی اساس

فن و ثقافت کسی ملک کے عوام کی اجتماعی شناخت کا خارجی اظہار ہوتے ہیں۔ مادی اور ذہنی قوتیں اس اجتماعی شناخت کو جنم دیتی ہیں۔ جس طرح ماحول انسان پر اثر انداز ہوتا ہے بالکل اسی طرح یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان بھی اپنے ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ انسان میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے خارجی ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اس نے لگاتار خود کو خارجی حالات کے تسلط سے آزاد کرانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں لیکن ان کوششوں کے معیار، کامیابی میں اسی تناسب سے اضافہ ہوا جس تناسب سے وہ انسانی مجبوریوں کا شعور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فطری قوتوں کی طاقت کا علم اور اس طاقت کے اسباب کا ادراک بھی حاصل کرتا رہا۔ انسان فطرتاً حاکم ہے مگر یہ حاکمیت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ فطرت کے قوانین کا علم حاصل کرنے کے بعد ان قوانین کے ساتھ اپنا رشتہ بھی جوڑے رکھے۔ ثقافتِ ہزارہ کی تاریخ کا اہم عنصر یہ ہے کہ جغرافیائی صورتِ حال نے اسے ایک ایسے قلعے میں تبدیل کر دیا ہے کہ جس کے سینکڑوں دروازے اور ہزاروں کھڑکیاں ہیں۔

اس خطے میں اباسین، کنہار اور دوڑ زندگی کی طرح رواں دواں ہیں جو اہلِ ہزارہ کے لئے اسی طرح اہم ہیں جس طرح مصر کے لئے دریائے نیل......دریائے سندھ کو اس کے معاون دریا برابر مالا مال کرتے رہتے ہیں۔ اس دریا نے کئی بار اپنا راستہ تبدیل کیا ہوگا جس کی وجہ سے اس کے کنارے پر آباد خوش حال لوگوں کو اپنی زمینوں سے دستبردار بھی ہونا پڑا ہوگا لیکن اپنے تمام تر تنوع اور تبدیلی کے باوجود یہ دریا ہزاروں سال سے یکساں طور پر بہہ رہا ہے۔ اسی طرح یہاں کی ثقافت کے مرکزی دھارے نے بھی تمام تر اونچ نیچ اور پر پیچ راہوں سے گزرنے کے باوجود رنگا رنگ ثقافتی صورتِ حال میں بھی اپنی یکسانیت اور ایک بنیادی مرکز سے وابستگی کو برقرار رکھا ہے۔

ایک برطانوی مصنف ارنسٹ بارکر، انگریزوں کی کرداری حیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "ہم نے اپنے ثقافتی ورثے میں (دوسرے علاقوں کے اثرات اور ثقافتی) خزانے بھی شامل کر لئے ہیں اور ان سب کو ہمارے ذہنوں نے قبول بھی کر لیا ہے پھر بھی اس (ثقافتی) آمیزے کے پیچھے ایک تشخص ضرور موجود ہے جس کی وجہ سے اس امتزاج کی تشکیل ممکن ہو پائی۔ سو ہمارا ملک صرف ایسی کٹھالی ہی نہیں جہاں مختلف ثقافتیں باہم گھل مل گئی ہوں اور اس عمل کی بدولت کوئی (ثقافتی) آمیزہ تیار ہو گیا ہو بلکہ ہمارے ماخذ کا پتہ لگانا بھی کوئی آسان کام نہیں"۔

بارکر کی یہ بات انگریزوں سے زیادہ اہلِ ہزارہ پر صادق آتی ہے کہ ان کے ثقافتی آمیزے کے پیچھے موجود تشخص ہزارہ کے لوگوں کی امتزاجی افتادِ طبع (syncretic genius) پر مشتمل ہے جس نے انہیں اپنے تاریخی تشخص کی وہ قوت عطا کی ہے جس کے سہارے وہ مسلسل حملوں اور متواتر ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود

منفرد طور پر زندہ رہے۔یہی امتزاجِ افتادِ طبع ان کی روایتی درشتی کا باعث بھی ہے جو حملہ آوار خانہ بدوشوں کے قدیم سماجی نظام کی سادگی سے مستقل تعلق رکھنے کے سبب پیدا ہوئی ہے۔اور اسی امتزاجی افتادِ طبع نے یہاں کے فن وثقافت کو جبر اور کھوکھلی اقدار کے ناتواں اثرات سے بھی محفوظ رکھا۔

ہر قوم کی تہذیب یا ثقافت کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے،اس کے آداب اور اس کے اخلاقِ ظاہری اور تیسرے اس کے فنون ......یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس یا مستحسن سمجھتا ہے اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر جب اس معاشرے کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں تو یہ اقدار بھی اس کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور پھر انہی عقائد اور احساسات کا اظہار مختلف فنون میں کرتے ہیں۔ان فنون سے بھی لوگوں کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ان میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔چنانچہ یہ تینوں عوامل ایسے ہیں جو ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور آپس میں منسلک بھی رہتے ہیں۔البتہ جب کسی مخصوص قوم کی تہذیب کا ذکر ہوتا ہے تو پھر ثقافت اور تہذیب کے خصائص پر بعض عمومی چیزوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔مثلاً اس قوم کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے اور اس قوم کی معاشرت کا انداز کیا ہے؟

ایک قوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تہذیب دوسری اقوام سے جدا ہوتی

ہے۔جس طرح ثقافت قومیت اور تہذیب ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں...... کسی ایسی قوم کا تصور کرنا مشکل ہے جس کی کوئی تہذیب نہ ہو اور نہ ہی کسی تہذیب کا تصور ممکن ہے جو کسی نہ کسی قوم یا گروہ سے وابستہ نہ ہو۔اب یہ ساری باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے فیصلہ کیجئے کی ہزارہ کی تہذیب وثقافت کی ماہیت اس کی موجودہ صورت کیا ہو سکتی ہے اوراس کے اجزاء کیا ہیں؟

ایک بات تو یقینی طور پر واضح ہے کہ ہزارہ کی تہذیب وثقافت پاکستانی ہے۔ پاکستانی تہذیب کی دو امتیازی خصوصیات ہیں ایک یہ کہ یہ پاکستانی ہے اور دوسری یہ کہ اس خطے میں بسنے والے افراد میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔یہ ہزارہ کی تہذیب وثقافت کے دو ترکیبی عناصر ہوئے۔اب سوال یہ ہے کہ گذشتہ صفحات میں قوموں کی تہذیب وثقافت کے جو تین پہلو تاریخ ،جغرافیہ اور معاشرتی نفوذ متعین کئے گئے ہیں ان کی کیفیت اہلِ ہزارہ میں کیا ہے؟

یہاں سے مشکلات شروع ہوتی ہیں ۔اسلئے کہ سیاسی اعتبار سے اس گروہ کی عمر محض ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہے کیونکہ آج سے ستر سال پہلے پاکستان ہی نہ تھا تو ظاہر ہے پاکستانیت کیسے ہوتی لیکن وہ خطہ جسے ہم ہزارہ کہتے ہیں اس کی تاریخی عمر اگر موہنجوداڑو سے بھی شروع کریں تو پانچ ہزار سال سے اوپر بنتی ہے ۔اب پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کی عمروں میں ایک دوسرے سے کیسے مطابقت پیدا ہو؟ اور کس طرح کی مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔یہاں ایک اور سوال بھی اٹھتا ہے کہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے جب پاکستان نہیں تھا تو یہاں کے باشندے کیا تھے؟اس سے پہلے بھی تو ان کی کوئی تعریف ہوگی ،کوئی نام ہوگا ......تو وہ کیا تھا؟اس سے پہلے یہاں کے

باسیوں کے دو نام تھے اور انہیں دو طرح سے پہچانا جاتا تھا۔ یہ لوگ تہذیبی اعتبار سے گجر، پنجابی، پٹھان، سواتی اور ترک وغیرہ تھے اور سیاسی اعتبار سے ہندوستانی مسلمان تھے ...... پاکستانی ہرگز نہ تھے۔ اب رہا تاریخ کا مسئلہ تو پہلا سوال یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کہاں سے شروع کریں؟ اگر پاکستانیت کی بات کریں تو اس ملک کی سیاسی تاریخ کی عمر ایک صدی سے بھی کم ہے اور اگر تہذیبی طریقہ اپنائیں تو لامحالہ موہنجوداڑو سے شروع کرنا پڑے گی ...... اس لحاظ سے پانچ ہزار سال میں جو بھی ادوار گزرے ہیں وہ ان کی تاریخ کا حصہ ہیں ...... ان میں برہمن تہذیب بھی ہے، بدھ تہذیب بھی اور یونانی تہذیب بھی ...... اگر ان تمام تاریخی ادوار کو اپنی تاریخ اور تہذیب کا جزو مانتے ہیں تو ان زمانوں کے تمام ہیرووں، مفکروں اور فنکاروں سب کو تہذیبی مورثوں میں شمار کرنا پڑے گا مثلاً اشوک، چندر گپت، سکندر اعظم، پورس، راجہ رسالو وغیرہ ...... اور اگر انہیں ہیرو نہ مانا جائے تو پھر سیاسی نظریات میں تبدیلی لانا پڑے گی کیونکہ تاریخ کا یہ جزو ہندوستان کیساتھ مشترک ہے اور پھر یہ غلط فہمی پیدا ہونے کی گنجائش بھی ہے کہ اصل میں تاریخ کا بہت تھوڑا سا حصہ ہی مختلف ہے باقی تاریخ وہی ہے جو ان کی ہے۔ اگر آپ اس قباحت سے نپٹنے کے لئے ان کی تاریخ ورودِ اسلام سے شروع کرتے ہیں ...... یا محمد بن قاسم کی برِ صغیر میں آمد سے شروع کرتے ہیں تو اس میں بھی بے شمار الجھنیں ہوں گی۔ سب سے بڑی الجھن تو یہ ہے کہ اس خطے میں جو مسلمان باہر کی دنیا سے آئے وہ ایک جیسی تہذیب، ثقافت اور تاریخ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق مختلف تہذیبوں سے تھا۔ پہلے عرب آئے، پھر محمود غزنوی کے ساتھ غزنہ اور ہرات سے ترک غلام آئے اور تغلق، خلجی، غوری اور پٹھان آئے، مغل آئے اور بیچ میں ایرانی بھی آئے۔

اب یہ جتنی بھی تہذیبیں ہیں ان کی اپنی اپنی تاریخ ہے یعنی اگر عربوں سے رشتہ ملاتے ہیں تو ان کی تاریخ امراءالقیس اور متنبی تک پہنچتی ہے۔اگر غوریوں سے، تغلقوں اور خلجیوں سے رشتہ ملاتے ہیں تو ان کی تاریخ چنگیز خان وغیرہ سے ملتی ہے.....تو اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم ان تہذیبوں میں سے جو کہ ایک تہذیب نہیں (اگر چہ دین ان سب کا ایک تھا) کس قومی تہذیب کے ساتھ ان کا رشتہ جوڑیں ۔ظاہر ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو فوقیت نہیں دے سکتے ۔اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے تو وہ سب برابر ہیں اور ان کی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ بڑی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی قوم ایسی نہیں جو اپنی تاریخ اسلام سے شروع کرتی ہے۔ان میں جتنی بھی مسلمان قومیں ہیں (جن میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں وارد ہوئیں)ان میں سب ہی اپنی تہذیب کو تاریخ اسلام سے پہلے سے شروع کرتے ہیں ۔جو زیادہ Orthodox اور زیادہ دین دار ہیں وہ تو حضرتِ آدمؑ سے شروع کرتے ہیں ۔ان میں سے جس کی نظر جہاں تک پہنچی اس نے وہاں سے اپنی تاریخ شروع کرلی ۔بعض یقطان اور قحطان تک جا پہنچے اور کوئی ملکہ سباء تک پہنچا.....بہر صورت وہ جسے اپنی تاریخ کا عمدہ ترین دور سمجھتے ہیں وہ دور ریستان اور حیلہ کی بادشاہتوں کا امراءالقیس اور متنبی کی شاعری کا زمانہ ہے جو کہ اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔اسی طرح ایرانی ہیں جو کہ اپنی تاریخ درفشِ کاویانی سے شروع کرتے ہیں، عراقی ہیں تو بابل کی تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں ۔کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو کہ اپنی ثقافتی وتہذیبی تاریخ ورودِ اسلام کی بجائے اپنے تاریخی ماخذ اور اپنے ابتدائی زمانہ سے شروع نہ کرے.....لہٰذا اگر ہم ہزارہ کی تہذیبی وثقافتی تاریخ کو ورودِ اسلام سے شروع کریں تو دینی طور پر تو ہم اس کا جواز پیش کر سکتے ہیں لیکن تہذیبی طور پر یہ بہت

مشکل ہے۔اب اگر ہزارہ کی تہذیب وثقافت اور تاریخ کو خطۂ زمین کی تاریخ سے آغاز کریں تو بہت سے چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور تاریخ سے مل جاتی ہیں اور اس صورت میں اسلام کا عنصر دب جاتا ہے اور اگر اسلامیت کو واحد بنیاد قرار دیں تو پھر پاکستانیت کا عنصر دب جاتا ہے۔اب اگر ہزارہ کی تہذیب اسلامی ہے تو پھر ایرانی ،تورانی ،سوڈانی اور انڈونیشیا والوں سے کیوں مختلف ہے؟؟

اب اگر جغرافیائی اعتبار سے ہزارہ کی تہذیب کا جائزہ لیں تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس تہذیب کا مرکز کیا ہے اور اس کے دائرے کے حدود کیا ہیں؟اب اور طرح کی مشکلات ہیں......مثلاً سب سے پہلے جسے یہاں کی خالص تہذیب کہا جا سکتا ہے وہ سندھ میں موہن جوداڑو کی تہذیب ہے جو سندھ میں ہے ہزارہ میں نہیں......اس کے کوئی ایک ہزار سال بعد آریہ یہاں وارد ہوئے اور آریائی تہذیب پیدا ہوئی جس کا مرکز بھی یہاں نہیں تھا......اس کا مرکز وادی گنگ وجمن میں تھا اور وہاں جب راجپوتوں کی بادشاہتیں قائم ہوئیں اور بڑے بڑے تہذیبی مراکز قائم ہوئے تو یہ اُدھر سے اِدھر آئی۔ اس تہذیب نے بہت سی چیزیں پیدا کیں اور یہ اپنی پیش رو تہذیب پر غالب آ گئی۔اس کے بعد تیسری بدھ تہذیب پیدا ہوئی بلکہ اس سے پانچ سو سال قبل مسیح ایرانی تہذیب یہاں پر آئی اور دو سو برس یہاں مسلط رہی۔یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی صنعتیں اور فنون لائے ،رسم الخط لائے۔یہاں پہ سکے بھی لائے اور یہ سب چیزیں یہاں کی تہذیب میں شامل ہو گئیں۔اس کے بعد تین سو سال قبل مسیح یونانی یہاں آئے وہ اپنے ساتھ لباس، سامانِ آرائش اور فنکار لائے اور یہ بھی یہاں کی تہذیب میں شامل ہو گئے۔پھر کوئی دو سو سال قبل مسیح بدھ تہذیب کا عروج ہوا۔اس زمانے میں چین اور وسطِ ایشیا کی جانب سے

کشن یہاں پہ آئے اور گندھارا تہذیب پیدا ہوئی۔اس گندھارا تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ اس خطہ زمین نے رومن تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑا اور بہت سے رومی اثرات یہاں پیدا ہوئے۔پھر ایک مختصر زمانہ ایرانیوں کا آیا۔پھر سفید ہن آئے جنہوں نے اس تہذیب کو ملیا میٹ کر دیا۔اس کے بعد بدھ مت کا زوال شروع ہوا اور پھر ہندو ریاستیں پیدا ہوئیں، اس کے بعد مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔مختلف ممالک کے مسلمان یہاں پہ آتے رہے۔اب ان تہذیبوں میں سے کوئی بھی تہذیب ایسی نہیں جسے کلیتہً اس خطے کے لوگوں کی تہذیب کہا جا سکے۔اب بالکل آخری عہد کی تہذیب لیں......یعنی ہندی مسلمانوں کی تو اس میں بھی کسی فن کو لے لیجیے......ہندوستان کی موسیقی جو مسلمانوں نے ایجاد کی اس کے موجد سلطان حسن شرقی اور امیر خسرو اور تان سین بھی ہزارہ بلکہ پاکستان کی حدود سے باہر ہیں۔فنِ تعمیر کو دیکھیں تو اس کے بڑے بڑے مراکز مثلاً تاج محل، لال قلعہ وغیرہ بھی ہماری جغرافیائی حدود سے باہر ہیں۔تو کیا ہم اس فن کو اپنا فن کہیں جو پاکستان میں پیدا ہوا؟اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو پھر تاج محل، لال قلعہ، غالب، میر، امیر خسرو اب سب کو اپنی تہذیب سے خارج کرنا پڑے گا جو ہم نہیں کر سکتے۔اگر ہم ان سب کو اپنی تہذیب میں شامل کرتے ہیں تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری تہذیب ہزارہ یا پاکستان میں محدود نہیں؟

اب اس بحث کی تیسری جہت دیکھیے......جسے گہرائی کہا گیا ہے۔کسی کلچر یا تہذیب کی کسی معاشرہ یا کسی سماج میں رسائی کہاں تک ہے اور کن طبقوں تک وہ پہنچتی ہے؟اگر اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو پھر بھی کافی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔سب سے بڑی پیچیدگی تو یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں موہن جوداڑو کو چھوڑ کر یہاں ہمیشہ دو تہذیبیں ہر

دور میں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں ۔ایک وہ تہذیب جسے کلاسیکی، درباری یا امراء کی تہذیب یاMetropolitan تہذیب کہا جائے گا یعنی جو بھی بادشاہتیں یہاں پہ قائم ہوئیں ان میں جو امراء تھے، جو درباری تھے اور جو ان درباریوں کا طبقہ تھا، ان سب کی ایک تہذیب ہوتی تھی، ان کی ایک زبان ہوتی تھی۔ ان کا مخصوص لباس، خاص اخلاقیات، منفرد آداب اور ایک الگ تہذیب تھی جو کہ اوپر کے طبقے کی تہذیب تھی ۔اب اس تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبیں تھیں جو کہ عوامی یاFolk تہذیبیں تھیں وہ مقامی تھیں ۔چنانچہ ایک اختلاف درباری اور عوامی تہذیب کا تھا اور دوسرا اختلاف مختلف مقامی اور عوامی تہذیبوں یعنی، سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچی کے علاوہ ہندو اور مسلم تہذیب کا تھا......یعنی جو تہذیب پنجابیوں کی تھی اس کی اپنی تاریخ تھی، جو پٹھانوں کی تہذیب تھی اس کی الگ تاریخ تھی اور ان کے اپنے خصائص تھے جو یقیناً سندھیوں اور بلوچیوں سے مختلف تھے۔ چنانچہ یہاں کی تہذیبی روایت میں دوطرح کی تفریحات تھیں ۔ایک درباری اور عوامی تہذیب کی تفریق اور دوسرے عوامی، مقامی یا علاقائی تفریق ......چنانچہ اس میں سے کسی ایک تہذیب کو خالص ہزارہ کی تہذیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ تہذیب ہر دور میں مختلف ہوتی رہی اور اس پر مستزاد یہ کہ ایک نئی تہذیب اس خطے میں متعارف ہوئی جو انگریز یہاں لائے تھے ۔جب انگریز یہاں پہنچے تو انہوں نے انتظامی امور چلانے کے لئے یہاں کے نظام میں ترمیم کی اور اپنا ایک افسر شاہی یا نوکر شاہی نظام پیدا کیا ۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا...... یہاں پہلے ایک امراء کا طبقہ تھا اور دوسرا دیہاتی عوام کا طبقہ موجود تھا اب ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوا...... شہروں کا سفید پوش طبقہ......جو ہم لوگ ہیں ۔اس طبقے کا نہ امراء کی تہذیب سے تعلق تھا

نہ دیہاتی تہذیب سے کیونکہ وہ اس سے کٹ کر شہروں میں آباد ہوئے تھے......ان کا تعلق نہ اُس تہذیب سے تھا نہ اِس سے......لہٰذا ان بچاروں کو مجبوراً انگریزی تہذیب کا سہارا لینا پڑا اور انہوں نے کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تہذیب کی نقالی کریں۔اسی طرح کا لباس پہنیں، اسی طرح کے گھر بنائیں اور اسی طرح کے رسم و رواج، آداب و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔چنانچہ یہ ایک تیسری چیز پیدا ہوئی۔اس وقت ہزارہ کے معاشرے کا جو تہذیبی ڈھانچہ ہے اس میں یہ سب چیزیں شامل ہیں۔اس میں پرانی درباری تہذیب بھی شامل ہے،اس میں مختلف عوامی تہذیبیں بھی ہیں اور سفید پوش طبقہ کی نیم مشرقی،نیم مغربی تہذیب بھی شامل ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان مسائل سے نپٹا کیسے جائے؟ پہلا سوال تو یہ ہے کہ موجودہ تہذیب کو ایک طرف ہندوستانی تہذیب سے اور دوسری طرف اسلامی تہذیب سے ممیز کیسے کریں؟ یعنی اس تہذیب کو جسے ہزارہ کی تہذیب کہا جا سکتا ہے اس کے تشخص اور انفرادیت کی پہچان کا کون سا طریقہ ہونا چاہیئے؟ اس پر ذاتی رائے تو دی جا سکتی ہے مگر اس کا قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ذاتی طور میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں ہماری وطنیت اور دینی دونوں طرح کے عناصر شامل ہیں اس لئے یہاں کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں لیکن اس میں ایک حصہ ایسا ہے جو ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں۔وہ اسلامی دور کا ایک ہزار سال کا حصہ اور اس کی تہذیبی روایات ہیں،اس کا فن،اس کے عقائد،اس کے رہنے سہنے کے طریقے،اس کے رسم و رواج ہیں جو غیر مسلموں اور ہندوستانیوں کی

تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں۔ چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیز کرتی ہے اور پاکستان سے منسلک ومربوط...... دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے۔ یہ ہم میں اور باقی مسلم ممالک کے ساتھ مشترک نہیں جو ہماری مقامی اور وطنی روایات ہیں۔ چنانچہ ہمارا وطن پاکستان ہمیں باقی اسلامی ممالک سے الگ کرتا ہے اور ہمارے دین کی روایات ہمیں غیر مسلم ہمسایوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مل کر ایک خصوصی چیز پیدا کرتی ہیں ......اور وہ انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے جسے ہم ہزارہ کا تہذیبی تشخص اور ثقافتی پہچان کہہ سکتے ہیں۔

ہر وہ چیز اور اچھی چیز جو ہماری گذشتہ چار سو سال کی پیداوار ہے وہ بھی ہماری ہے اور ہر وہ چیز جو پچھلے ایک ہزار سال کی روایتوں کا نتیجہ ہے خواہ اس کا جغرافیائی مرکز کہیں ہے وہ بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ چنانچہ حافظ اور خیام بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہیں اور چونکہ وہ اسلامی روایات سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وجہ سے غرناطہ بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے...... کیونکہ وہ اسلامی تہذیب سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے کاشی کاری اور وسطِ ایشاء کے دیگر فنون بھی ہماری تہذیبی شناخت میں شامل ہیں کیونکہ ان کا تعلق بھی براہ راست اسلام کی تہذیبی روایت سے ہے۔ اسی وجہ سے تاج محل، لال قلعہ، غالب، میر، امیر خسرو، تان سین یہ سب ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہیں اگر چہ جغرافیائی اعتبار سے وہ ہزارہ کی جغرافیائی حدود میں شامل نہیں ......اور یہی ایک صورت ہے جس میں ہم ہزارہ کی تہذیب کو ایک طرف بہت محدود ہونے سے بچا سکتے ہیں اور دوسری طرف بہت ہی confused اور پراگندہ ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ تاہم اس بات کو اب یقینی حد تک ذہنوں میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہزارہ کہ تہذیب وثقافت وہی ہے جو

ہزاروں سال سے یہاں کے عوام اور بالخصوص دیہاتی عوام کی تھی ......اس کے بے شمار رنگ اور آہنگ ہیں......انہی رنگوں اور خوبصورتیوں کے امتزاج کا نام ہزارہ کی تہذیب و ثقافت ہے اور اس کی اساس خالصتاً اس اسلامی معاشرے کی بنیادی روایات پر استوار ہے جو ہزاروں سال سے مسلم معاشروں اور تہذیب کا خاصا رہی ہیں۔

باب:سوم

ہزارہ میں عربی زبان وثقافت کا آغاز اور ارتقاء

ہزارہ کے علاقے میں اسلام کی روشنی دو طرف سے آئی اور اسی طرح اسلامی ثقافت، عربی زبان اور دینی علوم وفنون بھی دونوں راستوں سے اس خطے میں داخل ہوئے۔ پہلا راستہ سندھ سے ہوتا ہوا پنجاب کے اِس انتہائی شمال مغربی علاقہ ہزارہ بشمول ٹیکسلا اور راولپنڈی تک پہنچتا ہے اور دوسرا راستہ صوبہ خیبر پختون خواہ کو عبور کرتا ہوا پنجاب میں داخل ہوتا ہے۔

ہزارہ کو تہذیبی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے بہت ہی بلند مقام حاصل رہا ہے کیونکہ بعض مؤرخین کا اندازہ ہے کہ سب سے پہلا انسان پنجاب میں دریائے سواں کے کنارے آباد ہوا تھا(۱)۔ بعض علماء کے اندازے کے مطابق پہلے یا دوسرے یونانی دور میں اِنسان اس خطہ میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس خطہ میں مسلسل آبادی اور تہذیب وثقافت کا دور دورہ رہا۔ ٹیکسلا اور ہڑپہ کی کھدائی میں ملنے والے آثار سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ زمانہ قدیم سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس طرح ہزارہ میں عربی زبان اور علوم وفنون کو جو فروغ ملا اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔ کیونکہ اس خطہ میں ہزاروں انسان ایسے پیدا ہوئے جو عربی زبان سے واقف تھے اور سینکڑوں نے عربی زبان کی باقاعدہ تعلیم پائی اور پھران میں سے کتنے ایسے بھی تھے جو عربی میں اپنی تصانیف یادگار چھوڑ گئے۔

صدرِ اول کی اسلامی حکومت کا یہ عام دستور تھا کہ جب کوئی علاقہ اس کے زیرِ نگیں آتا تو وہ اس میں ایک طرف تو انتظامی امور کے لئے با قاعدہ حاکم مقرر کرتی اور دوسری طرف عوام کی تعلیم و تدریس کے لئے با قاعدہ قرآء، حفاظ، محدثین اور علماء کو بھی اس علاقے میں متعین کرتی ۔اس طرح سے حاکم و محکوم میں جو ثقافتی روابط قائم ہوتے وہ دین اور عربی زبان کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنتے ۔یہی وجہ ہے کہ ۹۲ ہجری (۷۱۱ عیسوی) میں جب مسلمان محمد بن قاسم کی قیادت میں فاتح کی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ملتان کو اپنا دوسرا بڑا مرکز بنایا اور لاہور سے آگے جہلم کی پہاڑیوں تک کا سارا علاقہ سلطنتِ اسلامیہ کی حدود میں داخل ہو گیا ۔یوں یہ علاقہ ہندوستان سے ثقافتی اور لسانی طور پر کٹ کر عملاً حکومتِ اسلامیہ کا حصہ قرار پایا ۔لیکن اس سیاسی الحاق سے پہلے بھی زمانہ نامعلوم سے عرب ہندوستان سے واقف تھے اور دُنیائے عرب اور ہندوستان کے تجارتی اور ثقافتی روابط بہت ہی قدیم زمانے سے ہیں ۔حتیٰ کہ قرآنِ مجید میں بعض ہندی الفاظ کی نشاندھی کی گئی ہے (۲)۔اس سے بھی آگے سید سلیمان ندوی نے ستیارتھ پرکاش مصنفہ سوامی دیانند کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کورو اور پانڈو کی لڑائی میں عربی زبان خفیہ بات چیت کا ذریعہ تھی (۳)۔

لی بان نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''تمدنِ عرب'' میں لکھا ہے کہ وہ اسلام سے قبل عرب تاجروں کے بڑی راستے سے یہاں کے لوگوں کے ساتھ تجارتی روابط تھے (۴)۔جس کی تصدیق چینی سیاحوں کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ علاقہ ساحلِ سمندر اور آبی راستوں سے کافی دُور واقع تھا اس کے باوجود غالب گمان یہی ہے کہ عربوں کے ہزارہ کے لوگوں کے ساتھ بھی تعلقات زمانہ

قدیم سے ہی استوار تھے۔ البتہ براہ راست رسمی اور لسانی روابط اس وقت استوار ہوئے جب فاتح سندھ محمد بن قاسم اور ان کا تجری لشکر لاہور کو، جو کہ ایک قدیم شہر ہے اور ہمیشہ سے علوم و ثقافت کا مرکز رہا ہے، عبور کرتا ہوا جہلم کی پہاڑیوں تک آ پہنچا اور یہی سیاسی روابط تاریخی خطہ پنجاب میں عربی زبان و ادب اور دینی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنے (۵)۔ یاد رہے کہ ۱۹۰۲ عیسوی سے پہلے تک یہ علاقہ پنجاب میں ہی شامل تھا۔

عرب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے اور رو د اسے ہند اور سندھ لکھتے تھے۔ گویا عربوں کی رائے میں سندھ بالذات ایک ملک اور حکومت تھی۔ عربوں کا قدیم سندھ موجودہ پنجاب کا بڑا حصہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔

سندھ میں عربوں نے جو سیاسی اور ثقافتی مراکز قائم کیے ان میں الور، دیبل اور منصورہ تو موجودہ سندھ میں قائم ہوئے (۶) جبکہ ملتان پنجاب میں ہے اور خضدار بلوچستان کا حصہ قرار پایا۔ اس حقیقت سے یہ دو امور عیاں ہوتے ہیں ...... ایک یہ کہ عربوں نے پنجاب میں ملتان کو اپنا سیاسی، ثقافتی اور علوم و فنون کا مرکز بنایا، دوسری سچائی یہ معلوم ہوتی ہے کہ پنجاب میں ملتان کو عربی زبان کا پہلا مرکز بننے کا شرف بھی حاصل ہے۔ عرب ان جملہ مراکز بشمول ملتان میں عربیت اور علوم و فنون کی تدریس کا معقول بندوبست رکھتے تھے (۷)۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سندھ بشمول اکثر پنجاب، میں عربوں کے دورِ حکومت میں سرکاری زبان عربی تھی، کیونکہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے بعض کتبے جو بھمبور اور دیگر علاقوں سے دریافت ہوئے ہیں، نیز ملتان کی قدیم ترین عمارتوں پر کندہ الفاظ، ان سب سے شہادت ملتی ہے کہ اس وقت تحریر و تقریر

کی زبان عربی تھی۔ اس امر کی تصدیق ابنِ حوقل (۸) اور مقدسی (۹) نے بھی کی ہے اور ان کی شہادت کے مطابق چوتھی صدی ہجری َدسویں صدی عیسوی) میں منصورہ، ملتان اور دیبل کے بازاروں میں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دو زبانوں کے اختلاط سے تیسری زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ عربی اور مقامی بولی یعنی سندھی کے اختلاط سے سرائیکی زبان پیدا ہوئی ہو جو پنجاب کے ایک بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور پھر سرائیکی زبان کے راستے عربی پنجاب کے دیگر حصوں کی زبان پر اثر انداز ہوئی اور ہندی پنجابی اور فارسی کے خلط ملط ہو جانے سے اس علاقے کی بڑی اور وسیع تر حصے میں بولی جانے والی زبان "ہندکو" نے جنم لیا ہو، کیونکہ سندھی، سرائیکی، پنجابی اور ہندکو زبان میں عربی زبان کے الفاظ اس کثرت سے ملتے ہیں جو ہندوستان کی کسی اور زبان میں نہیں ملتے۔

سندھ چونکہ خلافت اسلامیہ کے مرکز سے کافی دُور واقع تھا اس لئے اس میں ضعف اور انتشار پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے آخری حصہ میں اس انتشار نے انقلاب کی صورت اختیار کر لی اور ملتان میں ایک الگ حکومت قائم ہوگئی جس کے بعد اگرچہ ملتان اور اس کے زیرِ اثر علاقوں کا عرب دُنیا سے براہ راست رابطہ منقطع ہو گیا تھا لیکن عربیت کے جس پودے کا بیج اس علاقہ میں بویا گیا تھا وہ اب بڑھ کر ایک تن آور درخت بن چکا تھا۔

خلافتِ اسلامیہ کے اس عہد میں ہزارہ کے علاقے میں عربی زبان اور اسلامی علوم متعارف ہو چکے تھے اور ہمیں یقین ہے کہ مسلمان علماء نے دینی جذبہ اور ملی شعور سے سرشار ہو کر اس علاقہ میں تصنیف و تالیف کی گرانقدر خدمات سرانجام دی ہوں گی لیکن

افسوس کہ ان علمی خزانوں تک ہماری رسائی نہ ہوسکی اور دست بردِ زمانہ سے وہ علمی ذخیرے محفوظ نہ رہ سکے جیسا کہ چچ نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اصل عربی متن تو ضائع ہوگیا اور ہمارے سامنے اس کا صرف فارسی ترجمہ باقی ہے(۱۰) اسی طرح دیگر علمی تصانیف بھی ضائع ہوئی ہوں گی۔

اس عہد میں بغداد کو علمی مرکز کا درجہ حاصل تھا۔اس لئے ان علاقوں سے بہت سے اہلِ علم ترکِ وطن کر کے بغداد میں جا بسے(۱۱) اورانہوں نے وہاں ہندوستانی علوم، ریاضی، نجوم، طب، فلسفہ اور بلاغت وغیرہ کو متعارف کرایا اور ان علوم وفنون میں اعلیٰ مقام پیدا کیا۔پھر علوم وفنون کی خدمت کرنے والوں میں وہ موالی بھی شامل ہیں جو جنگی قیدیوں کے حیثیت سے ان علاقوں سے لے جائے گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عرب معاشرے میں ضم ہوکر رہ گئے اور سازگار فضا ملتے ہی ان میں بلند پایہ شعراء اور روایانِ حدیث پیدا ہوئے۔

مختصر یہ کہ اُس عہد میں یہ علاقہ نہ صرف عربی ثقافت سے واقف ہو چکا تھا بلکہ اِس میں عربی زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج تھی اور جس قدر علوم وفنون اُس وقت تک معلوم ہو چکے تھے اِن علاقوں میں اُن کی اشاعت شروع ہو چکی تھی اور یہاں سے ابتدائی علم حاصل کر کے علماء اعلیٰ تعلیم وتدریس کے لئے بغداد کا رخ کیا کرتے تھے اور یقیناً جب ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ علماء اپنے علاقوں کو لوٹتے ہوں گے تو ان علاقوں میں علمی چرچے عروج پر ہوتے ہوں گے۔اس طرح یہاں کے باشندوں اور عربوں کے درمیان سماجی، علمی اور ثقافتی تعلقات قائم ہوئے اور پروان چڑھتے رہے۔

ان علاقوں کے باشندوں نے عرب حکومت کے ابتدائی مراحل میں ہی

مسلمانوں کی ثقافت کو اپنا لیا تھا۔انہوں نے عربوں کے رسم و رواج، عادات، لباس حتیٰ کی ان کی زبان کو جو کہ ازمنۂ وسطیٰ میں مہذب دنیا کی بین الاقوامی زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی، ذریعۂ گفتگو بنالیا تھا۔لباس کے بارے میں بھی خاصے اثرات دیکھنے میں آئے تھے۔چنانچہ بارہویں صدی عیسوی میں ادریسی سندھ و ہند میں پہنچا تو اس نے یہاں کے لوگوں کو عربوں کی طرح شلوار و قمیص اور بعض علاقوں میں چغہ پہنے ہوئے دیکھا (۱۲) نیز ملتان اور منصورہ کی رعایا اپنے حکمرانوں کو عربوں کی طرح ''امیر'' کہہ کر پکارتی تھی لیکن غیر مسلم ان کو ''مہاراج'' کہتے تھے (۱۳)۔گویا فاتح اور مفتوح قوم دونوں ایک دوسرے سے اثر قبول کر رہے تھے۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے ربع آخر میں غزنویوں نے شمال مغرب سے ہندوستان پر یلغار کی۔۳۵۲ ہجری/ ۹۶۴ عیسوی میں الپتگین غزنی کا حکمران فوت ہوا تو اس کے عہد میں ہندوستان کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ غزنی میں اقتدار کے لئے اکھاڑ پچھاڑ جاری رہی تاہم ۳۶۷ ہجری/ ۹۷۶ عیسوی میں سبکتگین تخت نشین ہوا اور حکومت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی حدود کی طرف توجہ کی (۱۴)۔اس کے مقابلے کے لئے راجہ جے پال نے لشکر جرار تیار کیا تھا۔لمغان کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور مصالحت پر لڑائی ختم ہوگئی۔جے پال نے پھر سرتابی کی اور ہند کے دیگر راجوں کی مدد سے لڑائی کے لئے لشکر تیار کیا۔اس مرتبہ سبکتگین نے اسے شکست فاش دی اور لمغان سے پشاور بشمول دریائے اٹک کے اِس پار تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔

سبکتگین کے انتقال کے بعد ۳۸۸ ہجری/ ۹۹۸ عیسوی میں اس کا جانشین محمود

تخت آرائے غزنی ہوا۔ ۳۸۹ ہجری/۹۹۹ عیسوی میں اسے خلیفۂ بغداد کی طرف سے خلعت اور ''امین السلطنت یمین الدولۃ'' کا خطاب ملا۔ ۳۹۲ ہجری/۱۰۰۱ عیسوی میں محمود برصغیر کی حدود میں پشاور کے راستے داخل ہوا اور اس نے ہندو راجوں کے خلاف مسلسل کئی جنگیں لڑیں (۱۵)۔

۴۱۳ ہجری/۱۰۲۲ عیسوی تک محمود نے پنجاب کو سلطنت غزنی کے ساتھ باقاعدہ ملحق کرلیا تھا اور ان یہ سارا علاقہ بلاواسطہ اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا اور شمالی ہند میں پشاور اور لاہور نے اسلامی مراکز کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ان شہروں کو علماء صوفیا اور مبلغین نے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ نیز جاگیروں اور ملازمتوں کے حصول کی خاطر قبیلوں کے قبیلے غزنی، کابل اور بلخ وغیرہ سے منتقل ہوکر موجودہ خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں آباد ہونے لگے تھے۔ گویا اس طرح یہ علاقہ اسلامی ثقافت اور اسلامی علوم وفنون سے روشناس ہونے لگا تھا اور دینی علوم اور عربی زبان سے اس علاقے کا یہ دوسرا رابطہ تھا جو ماوراالنہر اور غزنی کے راستہ سے قائم ہوا۔ یہ رابطہ بعد میں اس قدر اہمیت اختیار کرگیا کہ اس علاقہ کو عراق وشام کی وراثت اور ہمسری زیب دیتی تھی۔

سلطان محمود خود بڑا علم دوست انسان تھا۔ سلجوقی اور غوری دور کی تصانیف میں محمود کی علم پروری اور عدل وانصاف پسندی کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ وہ مذہباً سنّی تھا۔ اولیاء اور صوفیاء کے ساتھ ساتھ اہلِ علم کا بڑا ادب کرتا تھا اور علم پھیلانے میں کوشاں رہتا تھا۔ ابوریحان البیرونی جیسا عالم اسی کے زیرِ سایہ تحقیق وجستجوئے علمی کے لئے آفاق میں گھومتا رہا۔ ان نے نندنہ (جہلم) میں بیٹھ کر زمین کا قطر معلوم کیا۔ ابوالفضل بیہقی، ابو نصر عتبی اور گردیزی جیسے مورخ اس کے منشی اور سیکرٹری تھے۔ شمس الکفاۃ احمد بن حسن

المیمندی جیسے نابغوں کو اس کی وزارت کا شرف حاصل رہا(۱۶)۔

۴۲۱ہجری/۱۰۳۰ءعیسوی میں سلطان محمود کا انتقال ہوا تو سلطان مسعود مسند آرائے سلطنت ہوا۔وہ بھی اپنے والد کی طرح بڑا علم دوست اور عالم نواز شخص تھا اور خود بھی اعلیٰ درجے کا مصنف تھا۔اس طرح یہ سیاسی خاندان علم پروری بھی کرتا رہا۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں عام طور پر اور پنجاب بشمول ہزارہ میں خاص طور پر علمی فضا پیدا ہوگئی۔ان کے علم دوست رویہ سے ہزارہ میں مسلمانوں کی آبادی کو بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔نیز اس کے بعد عہد غلاماں میں ہلاکو خان اور چنگیز خان کی تاخت وتاراج کی وجہ سے لوگ ایران، کابل،خوارزم،غور،خیوا، کاشغر وغیرہ سے جان بچا کر بھاگے اور برصغیر کے ان علاقوں میں آکر بس گئے جنہیں اس وقت ''ہزارہ'' کہا جاتا ہے۔اس طرح سے اس تاریخی خطہ میں اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان راسخ ہوگئی۔

محمود کے بعد سب ممالکِ مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے لیکن پنجاب (بشمول ہزارہ) پر مسلمانوں کا قبضہ رہا اور دوسو برس کے قریب خاندانِ غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی، لاہور دارالحکومت رہا۔مختلف اقوام وممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل،ایرانی،افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہلِ ہند کے ساتھ تمدن ومعاشرت،لین دین،شادی بیاہ،ہر قسم کے تعلقات پیدا کئے۔اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے مقامی الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کئے اور یہاں کے لوگوں نے عربی، فارسی،ترکی اور مقامی زبان کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے (۱۷) جس کے نتیجے میں لازمی طور پر موجودہ ہندکو زبان میں بھی وسعت اور ترقی ہوئی ہوگی۔

غزنوی جب اس علاقے میں داخل ہوئے تو ان کی دفتری زبان عربی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی علمی اور ادبی زبان بھی تھی۔ مسلمانوں کا مرکزی دربار خلافت بغداد میں تھا جس کی زبان بھی عربی تھی۔ مزید یہ کہ اس وقت تک صرف عربی ہی ایک ایسی زبان تھی جو دفتری زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اگرچہ غیر عرب ریاستیں وجود میں آچکی تھیں لیکن فارسی یا ترکی زبان کو اس درجہ ترقی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ وہ دفتری زبان بن سکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ محمود کی حکومت کے دور میں دفتری کاروبار عموماً عربی زبان میں ہوتا رہا۔ محمود غزنوی کا پہلا وزیر ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائنی عربی میں مہارت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے فرامین و مراسلات فارسی میں لکھوانے شروع کیے لیکن مراسلت کا یہ فارسی طریقہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور ابوالعباس کا عربی کے خلاف تعصب زیادہ دیر تک نہ چل سکا (۱۸)۔ ابوالعباس کے بعد خواجہ احمد بن حسن المیمندی وزیر ہوا تو اس نے مراسلات اور فرامین کی زبان پھر سے عربی قرار دے دی۔ اس سلسلے میں آقائے سعید نفیسی لکھتے ہیں:

> ''بہ سبب آنکہ در عربیت پیادہ و بے مایہ بود امثلہ و معاشیر دیوانی و مقدمات و احکام سلطانی را فرمودہ بپارسی نوشتن۔ وزیر احمد حسن اشارت گرداند تا برقرار قدیم و قاعدہ سالف مقدمات بروایت عربی نویسند''(۱۹)۔

اس طرح اس علاقے میں بھی عربی زبان کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں۔ ۴۲۲ ہجری/۱۰۳۰ عیسوی میں ابوالعباس نے دوبارہ وزارتِ اعظمٰی کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے دونوں عہدوں کے مابین ۴۱۶ ہجری/۱۰۲۵ عیسوی تا ۴۲۲ ہجری/

۱۰۳۰ عیسوی ابو علی حسن بن محمد بن عباس المعروف بہ "حسنک میکال" وزیرِ اعظم رہا۔اس کے دور میں بھی عربی زبان ہی دفتری زبان رہی۔سلطان محمود خود عربی زبان کا بلند پایہ عالم و فاضل تھا۔اس لئے اس کے عہد میں یقینی طور پر عربی زبان کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل رہا۔

منصورہ کے ساتھ ساتھ ملتان میں شروع سے ہی عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور غزنویوں کی آمد کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا جس کی شہادت ابن الحوقل کے سفرنامے سے ملتی ہے۔واضح رہے کہ ابن الحوقل نے چوتھی صدی ہجری کے آخری نصف میں ان علاقوں کا سفر کیا تھا اور وہ لکھتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے لوگ مقامی زبان اور عربی میں گفتگو کرتے تھے(۲۰) البتہ چوتھی صدی ہجری ختم ہوتے ہوتے ملتان میں دیلمیوں کا قبضہ ہوگیا تھا تو وہاں عربی کی جگہ فارسی نے لینی شروع کردی تھی۔

یہ حقیقت ثابت ہونے کے بعد کہ غزنویوں کے ہاں خواجہ ابوالحسن المیمندی سے لے کر ابوبکر بن صالح تک جو لوگ بھی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوتے رہے وہ سب عربی کے عالم و فاضل تھے اور سب نے عربی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے قائم رکھا، یہ بات بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے دیوان انشاء اور اس کے صوبوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی تھی وہ عربی زبان میں ہی ہوتی تھی اور لاہور جو ہندی محروسہ علاقوں کا دارالحکومت تھا وہاں بھی عربی ہی سرکاری زبان تھی اور مرکزی حکومت کے ساتھ ساری خط و کتابت عربی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ چنانچہ دفتری اصطلاحات میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور ابہام سے بچنے کے لئے عہدِ غزنوی میں اصطلاحات کا مفہوم متعین کیا گیا تھا اور اصطلاحات کی ایک طویل فہرست تیار کی گئی تھی

جن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فہرست میں شامل جملہ اصطلاحات عربی ہیں۔یہی نہیں کہ فارسی کلمات کی جگہ عربی کلمات تجویز کیے گئے تھے بلکہ بعض اوقات مفہوم کو بیان کرنے کے لئے خود عربی کلمات ہی کے مقابل عربی اصطلاحی کلمات مقرر کئے تھے۔مثلاً عطاء کی جگہ بذل،حکم کی جگہ قضیہ،آخر کی جگہ عقب،فضول کی جگہ تطاول، صیغہ کی جگہ عقار، مراد کی جگہ فرض اور خراج کی جگہ ضریبہ وغیرہ مقرر ہوئے۔(۲۱) بہر حال یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے کہ عہدِ غزنوی میں عربی زبان کی دفتری اصلاحات کس طرح متعین ہوئیں۔

اس بارے میں یقیناً دو آراء نہیں ہوسکتی ہیں کہ غزنوی دور کے خاتمے تک عربی زبان کے زوال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ابونصر عتبی نے اپنی تاریخ ''الیمینی'' عربی میں لکھی جبکہ اس کتاب کی زبان بہت ٹکسالی ہے لیکن ابوالفضل بیہقی نے اپنی مبسوط تاریخ تیس جلدوں میں فارسی میں قلمبند کی۔اسی طرح گردیزی نے اپنی ''زین الاخبار'' بھی فارسی میں تحریر کی۔اگر چہ غیر عرب ریاستوں میں غزنویوں کے بعد عربی سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ نہ رہی لیکن علمی اور ادبی میدانوں میں عربی زبان کی جو خدمت عجمیوں نے کی وہ عربوں کی خدمت سے کہیں زیادہ ہے(۲۲)۔اس لئے اس خطہ میں عربی علمی اور دینی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ہزارہ میں علومِ اسلامیہ اور عربی زبان و ادب کی باقاعدہ تدریس کا سلسلہ غزنویوں کے عہد میں قائم ہو گیا تھا۔اس زمانے میں لاہور کو چونکہ سیاسی، علمی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اس لئے بے شمار اہلِ علم نے اس مرکزِ علمی کا رخ کیا......کابل سے براستہ پشاور لاہور جاتے ہوئے ان لوگوں کو لازماً ہزارہ کو بطور گزرگاہ استعمال کرنا

پڑتا تھااور وہ کچھ عرصہ اس علاقے میں ٹھہر کر مقامی عمائدین اور فضلاء سے بھی مکالمہ و ملاقات کرتے تھے اور ان کے درمیان مکالمے کی زبان بھی عربی یا پھر مقامی ہند کو زبان ہی ہوتی تھی ۔ان میں سے بے شمار لوگ ایسے بھی تھے جو اس علاقے کی سرسبزی و شادابی اور آب وہوا کو دیکھ کر مستقلاً یہاں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں دعوت وارشاد کی مجالس برپا رکھیں۔ جب محدث اسماعیل (متوفی ۴۴۸ ہجری) پہلی بار لاہور میں جلوہ گر ہوئے اور انہوں نے وعظ و تبلیغ کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا (۲۳) تو عربی زبان کو سمجھنے اور پڑھنے کے رجحان میں مزید تیزی آئی ۔یوں اس خطے میں عربی زبان اور اسلامی ثقافت معیارِ فضیلت قرار پا گئیں ۔عربی اور منقول کی باقاعدہ تعلیم بدستور جاری رہی ۔البتہ مقامی ضروریات کے مطابق کچھ تغیرات بھی رونما ہونے شروع ہو گئے تھے اور عقلی علوم کے ابتدائی مدارج طے ہوتے رہے۔عربی زبان کا تدریسی مقام تو برقرار رہا البتہ اس دور میں روزمرہ کی بول چال میں پہلوی زبان کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی ۔

عربی اور پہلوی زبانوں کی باہم آمیزش سے جو نئی زبان ابھری وہ "فارسی" کے نام سے متعارف ہوئی۔اگر چہ علمی تصانیف میں عربی زبان کا بلند مقام ہمیشہ مسلم رہا تاہم شعروشاعری میں فارسی کو فروغ ملنے لگا تھا۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کی فارسی شاعری کے اوزان ،بحور، قافیے ،اصنافِ سخن ،صنائع و بدائع وغیرہ سب کے سب عربی زبان سے مستعار لئے گئے ہیں (۲۴) ۔یہی وجہ ہے کہ نظامی گنجوی نے کاتب یا دبیر کے لئے جو نصاب تجویز کیا (۲۵) اس میں قرآنِ حکیم ،احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہؓ، امثال عرب ،کلماتِ عجم اور مطالعہ کتب سلف کو لازمی قرار دیا۔جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خود فارسی ادباء عربی زبان کو کیا مقام دیتے رہے ہیں۔نیز عربیت کے تن آور درخت پر

فارسیت کی جو بیل چڑھی تھی وہ کس حد تک عربیت کے سہارے کی محتاج تھی؟ یہی نہیں تاریخ بیہقی کے مصنف کے بقول اس دور میں عربی زبان کو چھوڑ کر فارسی زبان کا استعمال جہل کی علامت تصور کیا جاتا تھا(۲۶)۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں علمی تصنیف و تدریس میں عربی کا مقام بلند رہا جبکہ فارسی محض تاریخ نویسی اور مجلسی آداب تک محدود رہی (۲۷)۔

جیسے جیسے اسلام پھیلا، اس کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس کے مسائل وضروریات میں اضافہ ہوتا رہا تو مسلمانوں نے نقلی علوم میں بھی اضافہ کیا۔ چنانچہ کتاب وسنت اور آثارِ صحابہؓ کے تحقیقی مطالعہ سے استنباط احکام کا عمل تدوین فقہ اربعہ کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ ضرورت ساری دنیا میں محسوس کی گئی اور اس کی نشو ونما میں دیگر بلادِ اسلامیہ کی طرح ہزارہ کے علماء وفضلاء نے بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ چنانچہ محمد بن حسن الصاغانی، ابوالحسن نعمت البصتالی (۲۸) سے لے کر جان محمد لاہوری اور محمد صدیق لاہوری سب اس میدان میں حصہ ڈالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے بعد قضاء کی ضرورتوں میں اضافہ ہوا تو تدریس میں فقہ کو زیادہ جگہ دی جانے لگی لیکن تفسیر وحدیث کو اپنی خاص حیثیت نیز فقہ کے بنیادی ماخذ ہونے کی بناء پر ترک نہیں کیا گیا۔

عربیت اور نقلی علوم کے ساتھ تمدن کی وسعت اور تعلقات کی افزائش کے سبب مسلمانوں کو دیگر اجنبی علوم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان اور عجم کے خاص عقلی علوم وفنون مثلاً منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت وغیرہ نے بھی نصاب تعلیم میں جگہ پائی۔ الغرض عربیت جس میں فارسی کی آمیزش تھی، منقول جس میں فقہ مقصود بالذات بن چکی تھی۔ معقول جس کا نیا نیا چرچا ہوا تھا، ان تینوں کے علم

اٹھائے غزنوی سپاہ اور اہلِ علم لاہور میں داخل ہوئے اور پھر یہیں سے روشنی لے کر غوری، اجمیر اور دہلی گئے اور یہیں سے یہ روایتِ حدیث پورے برصغیر میں پھیلی۔

اس عظیم خطہ میں درس و تدریس کو ہمیشہ بلند مقام حاصل رہا۔ چنانچہ غیاث الدین بلبن کے عہد میں جو علماء اس مقدس پیشہ سے وابستہ تھے وہ سبھی فقہ، اصولِ فقہ اور عربیت کے ماہر مانے جاتے تھے(۲۹)۔ مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں فقہ، اصولِ فقہ اور عربیت کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ اگرچہ عقلی علوم شاملِ نصاب رہے لیکن ان کی چنداں حیثیت نہیں تھی۔ فقہ کے ذوق و شوق کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" برہان الدین محمود بن ابی الخیر المرغینانی (م ۶۷۸ ہجری/۱۲۷۹عیسوی) کے ذریعے ہندوستان آئی اور پھر یہاں کی علمی فضاء پر اس طرح چھائی کی سارے معاشرے کو حنفی بنا کر رکھ دیا۔ اس زمانے یعنی ساتویں صدی ہجری میں ہزارہ (بھیر موڑ مضافاتِ ٹیکسلا) سے ایک حنفی عالم سیّد سلطان محمود الہندی (م ۶۹۹ ہجری/۱۲۹۱عیسوی) یہاں سے براستہ بغداد (عراق) مکّہ مکرمہ میں حج کی غرض سے پیدل سفر کر کے پہنچتے ہیں تو اُن کی زیارت اور بعض فقہی مسائل میں رہنمائی کے لئے وہاں کے فقہاء اور علمائے دین ان کی جائے اقامت پر جمع ہو جاتے ہیں(۳۰)۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں اس خطہ میں عربی زبان نہ صرف درس و تدریس کی زبان تھی بلکہ اس میں خطے میں عربی زبان و ادب کے نامی گرامی فضلاء اور عالم بھی موجود تھے۔

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند (۳۱) کے مصنف کے مطابق آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی میں محمد بن تغلق نے عقلی علوم کی سرپرستی میں اضافہ کیا اور اگلی

صدی میں پنجاب کے مشہور معقولی علماء شیخ عبداللہ تلنبی اور عزیز اللہ تلنبی (۴۲) نے اس علم کو بامِ عروج پر پہنچادیا۔تاہم عربیت اور فقہ واصول فقہ کی حیثیت مسلم رہی۔البتہ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک یہ آثار دکھائی دینے لگے کہ معقول کے مقابلے میں منقول کی حیثیت کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ ساتویں صدی کے مشہور پنجابی عالم محمد بن حسن الصاغانی (۶۵۰ ہجری/۱۲۵۲عیسوی م) کی ''مشارق الانوار'' کے علاوہ اس دور میں حدیث کی کوئی اور کتاب شاملِ درس دکھائی نہیں دیتی اور اگر کوئی شخص اس میدان میں بہت ہی ترقی کرتا تھا تو بغوی کی ''مصابیح السنۃ'' پر اکتفا کرلیتا (۴۳)۔

نویں صدی ہجری میں حدیث کا مقام اس سے بھی گھٹ کر رہ گیا جب وہ صرف برکت کے حصول کے لئے پڑھی جاتی تھی نہ کہ قانونی ماخذ اور کلید کی حیثیت سے۔ جیسا کہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کے الفاظ میں ''...... **علی طریقة البرکة لا للعمل به** ......'' (۴۴)، (حدیث صرف برکت کے لئے پڑھی جاتی نہ کہ اس پر عمل کرنے کے لئے)۔اس کے بعد تیار شدہ فقہ پر بھروسہ کا دور دورہ ہوا اور اس دور میں فقہ کے بنیادی ماٰخذ حدیثِ نبوی کی طرف توجہ کم سے کم ہوتی گئی۔اگرچہ ان تک عربیت کی حیثیت برقرار رہی لیکن دسویں صدی ہجری میں فارسی کو علمی دنیا میں کچھ نہ کچھ جگہ مل چکی تھی اور عربی کے ابتدائی قواعد اور فقہ کی ابتدائی کتب فارسی میں دستیاب ہو کر شاملِ درس ہوگئی تھیں۔تاہم اس دور میں بھی تعلیم وتدریس میں عربی زبان کو پہلا اور فارسی زبان کو دوسرا درجہ حاصل رہا(۴۵)۔حتیٰ کہ اس دور میں پنجاب کے مشہور ادیب اور مصنف ومفسر ابوالفیض فیضی (۱۰۰۴ء) نے بے نقط تفسیر ''سواطع الالہام'' لکھ کر عربی زبان کا مقام ہندوستان اور پنجاب کی جملہ زبانوں میں بلند کر دیا اور عربیت کو نہ صرف اپنا مقام قائم

رکھنے بلکہ اسے بلند کرنے میں خاصی مدد بہم پہنچائی۔لیکن اس دور میں عربی زبان کا ایک طرف فارسی سے مقابلہ تھا تو دوسری طرف ترکی اور سنسکرت وغیرہ بھی اس کے مقابلے میں کھڑی دکھائی دیتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ معقولات ،فلکیات اور ریاضیات جیسے سیکولر علوم بھی یلغار کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے عہد میں درس وتدریس کے نظام ہی میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی اور وہ ایک نئی شکل اختیار کر رہا تھا(۳۶)۔

اس دور میں پورے ہندوستان میں شیخ عبدالحق محدث، شاہ ولی اللہ اور شیخ احمد سرہندی جیسے اصحاب علم وفکر اور عمل کے پیکروں نے لوگوں کے اذہان وعقل کو اسلام کی صحیح اور سچی تعبیر سے واقف کیا جس کے اثرات براہ راست پنجاب پر بھی مرتب ہوئے اور عربیت اور معقولات کو پھر سے فروغ ملنے لگا اور مولانا نظام الدین سہالوی (۱۱۶۱ہجری/۱۷۴۸عیسوی) نے ایک نصاب مرتب کیا جو" درسِ نظامی" کے نام سے مشہور ہوا جو وقت کے تقاضوں کے پیش نظر نہایت متوازن تھا۔وہ نصاب گیارہ مضامین پر مشتمل تھا(۳۷) جس میں معقولات ،منقولات، عربیہ اور ہر طرح کے علوم وفنون کو مناسب جگہ دی گئی تھی ۔یہ درس نظامی نہ صرف پورے ہندوستان میں رائج ہوا بلکہ اس کے فیض یافتہ دنیا کے اکثر خطوں میں اب تک دین کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں، یہی نصاب ہزارہ کے جملہ علاقوں اور مدارس میں زیر تدریس آیا اور اس کے بعد کے اکثر علماء نے اپنی تصانیف کا دائرہ ان نصابی کتب کی شروح وحواشی لکھنے تک محدود رکھا۔برصغیر میں انگریزوں کی آمد تک درس نظامی بعض ترامیم کے ساتھ پورے پنجاب بشمول ہزارہ میں رائج رہا البتہ اس میں صرف ونحو پر زیادہ زور دیا جانے لگا جبکہ عربی ادب کی مقدار کم ہوگئی تھی ۔اسی طرح کلام ،حکمت ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کو زیادہ اہمیت حاصل

ہوگئی لیکن تفسیر اور حدیث کو ان کا صحیح مقام حاصل نہ رہا۔ البتہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد سے اس خطہ میں دورہ حدیث کا رواج ہوا جس کے تحت طالب علم صحاح ستہ پڑھ تو لیتا لیکن ان کے مطالب سے واجبی سا واقف ہوتا تھا (۳۸)۔

اس سارے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہزارہ میں مسلمانوں کی آمد سے لیکر قیامِ پاکستان تک عربی کا کیا مقام رہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گیارہ بارہ صدیوں پر پھیلے ہوئے اس طویل عرصہ میں جو بھی سیاسی اور اجتماعی تغیرات رونما ہوئے اور بیرونی یا اندورنی جو بھی اثرات فضا میں ابھرے وہ عربی زبان اور دینی علوم کی مسلمہ حیثیت پر اثر انداز نہ ہو سکے اور یہ ہر دور میں بدستور علم، فضیلت اور ثقافت کی علامت بنے رہے اور ہر عہد میں علم کے حصول کے لئے عربی زبان بنیادی شرط رہی اور خاص طور پر جہاں دینی علوم ہونگے وہاں عربی زبان ناگزیر ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ تک رسائی عربی زبان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ نیز تصوف اور دیگر علوم پر ملکہ کا حصول بھی عربی زبان کے بغیر متصور نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اتنی طویل مدت میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں آیا کہ عربی زبان پر عبور حاصل کئے بغیر کوئی شخص عالم، فاضل، مصنف یا تعلیم یافتہ کہلا سکے اور البیرونی کے عقیدے کے مطابق "بنے بنائے قصر کی کلید (عربی زبان) ہاتھ میں ہوتے ہوئے نئے مکان کی تعمیر حالات اور عقل دونوں کے تقاضوں کے منافی ہے" (۳۹) یعنی عربیت کو چھوڑ کر مقامی زبانوں میں لکھنا اپنے کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح شعوبیہ تحریک سے لے کر قومیت کی جدید تحریکوں تک مسلم اقوام میں عربوں کے خلاف سیاسی جذبۂ رقابت تو ابھرا لیکن عربی زبان کے خلاف کم ہی آواز

بلند ہوئی۔اس خطے کی پوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزنویوں کے بعد اگر چہ یہاں کی سرکاری زبان عربی نہ رہی لیکن دینی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے اسے بلند مرتبہ حاصل رہا اور جو فاضل مصنف مقامی حدود سے نکل کر اپنی بات پورے عالمِ اسلام میں پہنچانے کا داعی ہوتا تھا وہ صرف عربی زبان کو ہی ذریعہ اظہار بناتا تھا۔ایسا کرتے وقت بھی عربیت کا دینی اور لسانی پہلو پیشِ نظر رہتا تھا۔

ہم جس خطہ کے متعلق بحث کر رہے ہیں اس کا تعلق عربی زبان اور عربوں کے ساتھ دو ذرائع اور راستوں سے ہوا۔ہزارہ عربی زبان سے پہلی بار سندھ کے راستے متعارف ہوا۔یہ وہ وقت تھا جب اہلِ عرب میں تصنیف وتالیف کا رواج بہت ہی محدود تھا اور وہ زیادہ تر قوتِ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔لہٰذا اس دور کی تصانیف تک ہماری رسائی نہیں ہوئی۔اس لئے ان کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔

ہزارہ میں عربیت اور اسلامی علوم سے دوسرے طریقے سے اس وقت واقف ہوا جب غزنوی موجودہ افغانستان اور پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ سے ہوتے ہوئے پنجاب پہنچے اور اپنے ساتھ بہت سے علماء اور فضلاء کو لائے اور جب اس خطہ میں تصنیف وتالیف کے لئے حالات سازگار ہوئے تو بیشتر علوم وفنون کی تنقیح وتہذیب ہو چکی تھی اور خاص طور پر منقولات میں ترقی واضافہ کی گنجائش بہت ہی کم باقی تھی۔اس لئے صرف جمع وترتیب اور بیان وشرح میں ترقی واضافہ کی قابلیت کے جوہر دکھائے جا سکے۔چنانچہ اس سلسلے میں الصاغانی نے بہت ہی عمدہ کام کیا اور ''مشارق الانوار'' جیسی بلند پایہ کتاب علمِ حدیث میں ترتیب دی اور جس کی وجہ سے اس خطے کو علمی حلقوں اور طلبائے حدیث میں شہرتِ دوام ملی نیز الصاغانی نے موضوع احادیث کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس سلسلے

میں ''درالملتقط فی تبیین الغلط'' کے نام سے ایک قابلِ قدر کوشش کی۔فیضی اور دیگر بہت سے علماء نے قرآنی تفاسیر لکھیں۔پھر فقہ میں حکومتی ضرورتوں کے پیش نظر ابوالحسن نعمت البصتالی نے ''اصول والمسائل الربا والمضاربت'' اور عہدِ عالمگیری میں ''فتاویٰ عالمگیری'' مرتب ہوا تو مولانا محمد اکرم لاہوری نے اس میں بھرپور حصہ لیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس ''فتاویٰ'' کی ترتیب میں ایک چوتھائی حصہ کام کی انہوں نے نگرانی کی۔

یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ نظام تعلیم میں کتبِ درسیہ کو غیر معمولی اہمیت اور مرکزیت حاصل رہی ہے۔پچھلے زمانے میں علماء کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کی لکھی درسی کتب مختصر اور حد درجہ جامع ہوں۔استاد کو ایسی کتابیں پڑھاتے وقت شرح وبسط سے تقریر کرنا ہوتی تھی جس کی بدولت نصاب میں شامل کتابوں کی شروح مرتب ہوئیں اور حواشی وغیرہ بھی لکھے جانے لگے۔ہزارہ کے علماء کا بھی یہی حال رہا اور انہوں نے اس میدان میں بہت سے کمالات دکھائے اور اساسی کتب کی شروح اور حواشی لکھے۔اس ضمن میں مولانا عبدالعزیز عثمانی ہزاروی (۱۲۸۰-۱۳۵۴ہجری) کی ''استجلاء البصر من شرح نخبة الفکر'' اور مولانا سکندر ہزاروی (۱۳۰۰-۱۳۶۳ہجری) کی شرح'' ھدایة النحو'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔اسی طرح شیخ ابو یوسف، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، محمد یعقوب البناتی اللاہوری کی شروح سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ان سب کتب کے مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان کتابوں کا معیار ایران، خراسان نیز عرب ممالک میں تصنیف شدہ کتب سے کسی طور بھی کم نہیں۔یہ کتابیں آج بھی مقبول ہیں اور متعلقہ موضوعات پر تحقیق کرتے وقت ان کتب سے استفادہ کیے بغیر نہ تو تحقیقی کام مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی تاریخی تسلسل قائم رہ سکتا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ نکتہ اٹھایا جائے کہ ہزارہ میں ہونے والا کام مقدار میں بہت کم معلوم ہوتا ہے تو اس کے جواب میں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ایک یہ کہ ہزارہ کے علاقے میں ابتدائی ادوار میں جو کام ہوا وہ ہم تک پہنچا ہی نہیں کیونکہ وہ ابھی تک متعارف ہی نہیں ہوا۔دوسری بات یہ ہے کہ ہزارہ ہندوستان میں اسلامی مرکز سے خاصا دور واقع ہوا ہے۔لہٰذا جو پذیرائی دہلی، لاہور اور ملتان کے علماء کو حاصل ہوئی وہ ہزارہ کے علماء کو میسر نہ آ سکی۔جس کی وجہ سے ہزارہ سے بہت سے اہل علم ترکِ وطن کر کے دہلی، لاہور اور سندھ میں چلے گئے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو کر رہے۔اس کے علاوہ ہزارہ پر سکھوں نے بھی طویل عرصے تک حکومت کی ہے۔اس دور میں یہاں کے مسلمانوں پر جو ستم ڈھائے گئے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علوم اور کتابوں پر کیا بیتی ہو گی؟ اور ان کی علمی میراث کو مٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا ہوگا؟

اس خطہ میں علم کی جو بھی خدمت ہوئی وہ باہر کی دنیا پر عیاں نہ ہو سکی۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کے بارے میں جو بھی تذکرے لکھے گئے ان میں یہاں کے علماء کو مناسب مقام نہ مل سکا اور ان کی علمی خدمات کو متعارف نہ کرایا گیا۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اہل علم کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ گوشہ نشینی کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے جو یا تو ان کی وفات کے بعد وہیں ضائع ہو جاتے تھے یا اگر دستبردِ زمانہ سے بچ جاتے تو خاندانی وارثت قرار پاتے اور طاقوں میں سجے رہتے اور ان کی طباعت کی کبھی نوبت نہ آئی۔آج بھی اگر پورے ہزارہ کا علمی جائزہ کیا جائے تو ایسی ہزاروں کتابیں ملیں گی جن سے ابھی تک علمی دنیا روشناس نہیں ہو سکی ہے۔

ہم اپنے مضمون کو صاحبِ تاریخ مخزن پنجاب کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

"مسلمان بادشاہوں کے وقت میں عربی و فارسی علم کو بہت ترقی ہوئی تھی جو ہندوں اور مسلمانوں کو پڑھائی جاتی تھیں"(۴۰)۔

حواشی وماخذات

۱۔ رشید احمد ندوی: مغربی پاکستان کی تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۵ء، ص ۶۵

۲۔ تاریخ ادبیات پاک و ہند، لاہور، جامعہ پنجاب، جلد۲، ص ۱

۳۔ سید سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات، احمد آباد، ہندوستانی اکادمی ۱۹۳۰ء، ص ۱۰

۴۔ لی بان، تمدن عرب (ترجمہ سید علی بلگرامی)، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۸ء، ص ۵۰۳

۵۔ اشفاق سلیم مرزا (مدیر) سہ ماہی "ثقافت" اسلام آباد جلد۱، شمارہ۲، فرید الدین شیر کوٹی، ص ۶۱

۶۔ حامد محمود (مدیر) تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، لاہور، جلد۲، ص ۳

۷۔ اس پورے باب میں "عربیت" کا لفظ اپنے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مراد عربی زبان کے ساتھ ساتھ عربی ثقافت اور عرب تعلقات وغیرہ ہیں۔ عربوں سے علوم کے علاوہ جو کچھ دنیا کے اس خطہ میں منتقل ہوا اس اصطلاح سے وہ بھی کچھ مراد ہے۔ جبکہ علوم کا تذکرہ علیحدہ بھی ہوتا رہے گا۔

۸۔ ابن حوقل، "کتاب صورۃ الارض"، لائیڈن، مطبع بریل ۱۹۳۸ء (دوسرا ایڈیشن) ص ۳۲۵

۹۔ المقدسی، احسن التقاسیم، لائیڈن، ۱۹۶۰ء ۴۷۹

۱۰۔ علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، چچ نامہ (فتح نامہ سند)، اسلام آباد، ادارہ تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۳ء ص ۸

۱۱۔ البیرونی، کتاب الھند کتاب البیرونی تحقیق ماللھند، حیدر آباد دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۷۷ ہجری، ص ۳۸

۱۲۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد۱، ص ۳۷

۱۳۔ عتبی، تاریخ یمینی، مطبع نامی پریس، سن ندارد، ص ۱۳۳

۱۴۔ ایضاً ص ۱۲، ۱۷، ۳۵

۱۵۔ ایضاً ص ۱۳۳

۱۶۔ استاد خلیلی، سلطنت غزنویاں، ص ۲۸۴-۲۸۶

۱۷۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۴۱ء، ص ۱۰

۱۸۔ استاد خلیلی، سلطنت غزنویاں، ص ۲۸۴

۱۹۔ دریبرا سون تاریخ بیہقی، ص ۱۴۱-۱۴۴

۲۰۔ ابوظفر ندوی، تاریخ سندھ، اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین، ۱۳۶۲ ہجری، ص ۲۳، ۶۵، ۸۶۱

۲۱۔ تفاصیل کے لئے دیکھیے:

(الف) علی اصغر، پاری نغز، لاہور، مطبع نامی پریس، سن ندارد

(ب) دریبرا سون تاریخ بیہقی ۱۰۰۶-۱۰۱۳ ہجری

(ج) تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد ۲، ص ۷۰-۷۶

۲۲۔ ابن خلدون نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "من الغریب الواقع جملة علوم فی الملة الاسلامیة اکثرهم العجم لا من العلوم الشرعیه ولا من العلوم العقلیه الا فی القلیل النادر" ...... (مقدمہ، طبع مصر، ص ۱۲، ۱۷، ۳۵)

۲۳۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء ص ۴۵، ۴۶

۲۴۔ تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھیے: "شعر العجم از شبلی نعمانی" اور "عربی زبان کے فارسی پر اثرات از ڈاکٹر داؤد پوتا"۔

۲۵۔ چہار مقالہ (تحقیق ڈاکٹر معین الرحمن)، تہران (تیسرا ایڈیشن)، ص ۴۲

۲۶۔ تاریخ بیہقی، ص ۱۷۰

۲۷۔ زبیر احمد، عربی ادب میں برصغیر کا حصہ، لاہور، شیخ محمد اشرف، سن ندارد ص ۴۶

۲۸۔ افسر و کاتب دیوان انشاء {۴۱۴ ہجری/۱۰۲۳ عیسوی تا ۴۱۵ ہجری/۱۰۲۴ عیسوی} بعہد محمود غزنوی اور مصنف "اصول والمسائل الربا والمضاربت" ...... جن کا آبائی تعلق ہزارہ کے موضع بگلی (پکھلی) سے تھا ...... بحوالہ "ڈاکٹر محمد رمضان علوی، ہندوستانی کے علماء کی عربی تصنیفات (انگریزی)، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، سن ندارد، ص ۲۵۴، ۲۵۵

۲۹۔ عبدالحی رائے بریلوی، نزهة الخواطر و بهجة السامع و النواظر، کراچی، نور

محمد اصح المطالع، ۱۹۷۶ء، جلد ا (المئة السابعة)

۳۰۔ ڈاکٹر محمد رمضان علوی، ہندوستان کے علماء کی عربی تصنیفات (انگریزی)، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، سن ندارد، ص ۲۱۳

۳۱۔ عبدالحیٔ رائے بریلوی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳، ۱۴

۳۲۔ تلنبہ، ملتان کی ایک مضافاتی بستی جوان دونوں بھائیوں کی وجہ سے اسلامی دُنیا میں آج بھی معروف ہے۔

۳۳۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، مطالعۂ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء، ص ۷۵، ۷۶

۳۴۔ عبدالحیٔ رائے بریلوی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳

۳۵۔ حضرت محمد ﷺ کے عہد میں ہندوستان میں علوم کا فروغ (باب: قانون)، لندن، ۱۹۶۱ء، (اس کتاب میں مختلف مقامات پر اس مفہوم کی عبارت درج ہے)

۳۶۔ ابوالفضل العلامی، آئین اکبری، لکھنؤ مطبع نول کشور ۱۸۸۲ء ص ۲۰۲

۳۷۔ مولوی ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، لاہور، مکتبہ خاور، ۱۹۷۹ء، ص ۹۷، ۹۸

۳۸۔ اس اصطلاح سے عموماً حدیث نبوی کی چھ مشہور کتب صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ مراد لی جاتی ہیں۔

۳۹۔ ظہیر الاسلام، قاہرہ، ۱۹۶۲ء جلد ۲، ص ۲۸۹

۴۰۔ غلام سرور لاہوری، مفتی، تاریخ مخزن پنجاب، لاہور، ۱۸۸۷ء ص ۱۲

باب چہارم

ہزارہ کے لوک گیت اور ان کی اقسام

کسی قوم کے جذبات اور فکر کو سمجھنے کے لئے لوک گیتوں کا مطالعہ انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ انہی سے اس معاشرے اور تہذیب کی تاریخی قدامت کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں کون لوگ حکومت کرتے رہے اور ان کا طرزِ حکومت کیا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے سماجی و معاشرتی حالات اور اطوار کیا تھے۔ ان لوک گیتوں سے ہمیں مقامی معاشرت، رسم و رواج اور لوگوں کے رہن سہن کے انداز کا پتہ چلتا ہے۔ ان لوک گیتوں سے ہمیں زندگی کی حقیقی تصویر اور سچائیاں ایسی سادگی اور محاورے کے ساتھ موتیوں کی مالا کی طرح اُس روایت سے جڑی ہوئی ملیں گی جو دِلوں میں جذب ہو کر صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔

اسی طرح دُنیا کی ہر زبان کے ادب میں شاعری موجود ہے۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شعر کا جنم ہوا...... لہٰذا شاعری نثر سے بہت پہلے وجود میں آئی۔ قدیم عہد ہی سے اِنسان شعر کی بدولت زندگی گزارتا آیا ہے لیکن ابھی تک شعر کی جامع، ٹھوس اور قطعی تعریف نہیں کی گئی۔ تاہم دانشوروں نے شعر کی تعریف کے بارے میں بے شمار آرائیں دی ہیں۔ جن کی کسوٹی پر شعر کے معیار کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ شاعری

ایک ایسا نرم و نازک گلدستہ ہے جس کا اپنا ایک الگ ہنر ہے اور جس کا مقصد حُسن پیدا کرنا ہے۔ حُسن کا تعلق اُس محبت سے ہے جس سے خوابیدہ جذبات بیدار ہو جائیں...... رُوح کا غنچہ کھل اُٹھے اور نَس نَس میں نشہ بھر جائے۔ شعر و ادب دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح حُسن کے چشمے ہیں جن کا تعلق رُوح سے ہے۔ شعر تو ہوتا ہی دِل کی آواز ہے اس کا کام سچائی کی تلاش اور نکھار ہے۔

زِندہ زبانیں مختلف تہذِیبوں اور ثقافتوں کے اِمتزاج اور اثرات کو قبول کرتی رہی ہیں۔ اِن میں زندگی کے تمام ذائقے اور لطافتیں موجود ہوتی ہیں۔ ہندکو زبان اپنی قدامت اور قامت میں اُتنی ہی قدیم، زِندہ اور جاندار ہے جتنا ہمارا ماضی اور حال ہے۔ ہندکو زبان اور اِس کی تاریخ کے بارے میں بہت سی متضاد آراء اور تذکرے ملتے ہیں، لیکن دو چیزوں پر تاریخ اور مؤرّخ متفق نظر آتے ہیں...... ایک اِس کی قدامت اور دوسرے اِس کا وجود ہے...... ہندکو زبان اِس خطے کی قدیم ترین اور ہر لحاظ سے بھرپور زبان ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ زبان اِس سرزمین پر آنے والے حملہ آوروں، مہم جوؤں اور مختلف مذاہب کے مبلغین کی مادری زبانوں کے اثرات اور کسی حد تک اپنوں کی بے اعتنائی کی بدولت ایک تسلسل کے ساتھ اپنی صحیح پرورش و پرداخت کے عمل کا مؤثر دفاع نہیں کر سکی۔ قدیم ہند دور سے لے کر تقسیم تک جغرافیائی حدود کے سکڑنے اور پھیلنے کے عمل نے اِس کو ایک محدود علاقے کی زبان بنا دیا...... پھر بھی اِس کا اپنا ایک منفرد تشخص اور تہذیبی و ثقافتی پسِ منظر ہے۔

ہزارہ کی سرزمین وسیع و عریض میدانوں، سرسبز و شاداب اور خوشنما منظروں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، قدرتی چشموں، سنگلاخ چٹانوں، خوش منظر وادیوں، برف پوش

پہاڑوں، زرخیز کھیتوں، خارزاروں اور مرغزاروں پر مشتمل ہے۔ یہاں پر چشموں، ندی نالوں، دریاؤں، اور پنگھٹوں کی کمی نہیں۔ یہاں ایسے گھر بھی ہیں کہ جہاں شفاف اور شیریں پانی کے چشمے اُبلتے ہیں اور ایسے مقامات بھی ہیں جہاں دوشیزاؤں کو ایک گھڑا پانی بھرنے کے لئے ایک لمبی اور دشوار گزار مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔

یہ خطہ جغرافیائی طور پر دنیا کے کسی بھی خوبصورت مقام سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں۔ یہ خطہ اُس تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہا ہے جہاں آریائی، ویدک، عرب، یونانی، تاتاری، منگول اور ترک مغلوں کے قافلے ٹھہرے اور تہذیبیں پھلیں پھولیں اور مٹتی رہیں۔ اس سرزمین کے لوگ گیتوں میں زندگی کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ اِس کے لوک گیت سوچ اور جذبوں کے اظہار کا ایسا وسیلہ ہیں جو صدیوں سے ہزارہ کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر کے لوگوں نے اپنایا ہوا ہے۔ یہ لوک گیت کسی ایک مخصوص شاعر کی دماغی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ ہر ایک کی ملکیت ہیں۔

لوک گیت ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کی تاریخ مبہم حد تک پرانی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اس کے بول اتفاقیہ طور پر اور اختصار سے چند حساس لوگوں کے مافی الضمیر سے اُبھر کر زبان زدِ عام ہو گئے ہوں گے، جن میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ بہر حال اصلیت کچھ بھی ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ لوگ گیت انسانی ذہن کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے موضوع اپنی اقسام کی طرح مختلف ہوتے ہیں۔ ہندکو زبان کا دامن لوک گیتوں سے مالا مال ہے۔ لہٰذا اصنافِ سخن کے اعتبار سے بھی یہ زبان دُنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں۔ یہاں کے لوک گیتوں میں ''ماہیا'' ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو قدامت کے لحاظ سے ہندکو زبان کے

شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ بلکہ یہ صنفِ سخن قدامت کے لحاظ سے ہزارہ کے تمام لوک گیتوں میں قدیم ترین ہے۔یہ بات بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان میں سب سے پہلا ادب، شعر کی صورت میں مرتب ہوا......اور شاعری میں لوک گیتوں کو ہر لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔یہ کسی ایک فرد، گروہ یا علاقے کی ملکیت نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا مالک و خالق ہر وہ شخص، گروہ، یا علاقہ ہوسکتا ہے جس میں یہ تخلیق ہوئے...... پھلے پھولے اور زبان زدِ عام ہوئے۔

لوک گیت ان خودرو اگنے والے پھولوں کی طرح ہوتے ہیں جو دھرتی کی نرمی اور زرخیزی کی بدولت زمین کی کوکھ سے از خود جنم لیتے ہے۔فطرت کی گود میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور پھر اپنے خوش نما رنگوں سے دل و دماغ تک اتر جانے والی مہک سے ماحول کو معطر بنا دیتے ہیں۔لوگ گیت کسی بھی قوم کا انمول خزانہ ہوتے ہیں جن میں نہ صرف اس قوم کی تہذیب وتمدن اور معاشرت کی خوبصورت تصاویر ہوتی ہیں بلکہ ان میں اس قوم کے بزرگوں کے صدیوں کے تجربے، مشاہدے اور دانش کی باتیں کے علاوہ اس قوم کے رسم و رواج اور ماضی سے وابستہ اقدار کی جھلکیاں ، اس کی لہلہاتی فصلوں، ٹھاٹھیں مارتے دریاؤں، اور گیت گاتی ندیوں، فلک بوس پہاڑوں، برف پوش وادیوں، میلوں پھیلے کھیتوں، کھلیانوں، آبشاروں اور جھرنوں کا بیان ملتا ہے۔ جو قومیں ریگستانوں اور صحراؤں میں آباد ہوتی ہیں ان کے لوک گیتوں میں ریتلے ٹیلوں نخلستانوں، پانی، آندھیوں، اونٹوں اور بھیڑوں کا کثرت سے ذکر ہوتا ہے۔اور جو اقوام پہاڑی علاقوں میں بستے ہیں ان کے لوک ادب میں پہاڑوں، دریاؤں، ندی نالوں، چشموں، پرندوں، برف پوش وادیوں، سرسبزی، گھنے جنگلوں اور خوشنما وخوش الحان پرندوں وغیرہ کا

ذکر ملتا ہے۔جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لوک گیتوں کا اپنی دھرتی اور معاشرت اور سماجی زندگی سے کتنا گوڑھا تعلق ہوتا ہے۔

لوک گیت دراصل وہ جذبے ہیں جو کسی جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے لوگوں کے دلوں میں جنم لیتے ہیں اور پھر از خود لفظوں میں ڈھل کر انگور کے رس کی طرح انسان کے ہونٹوں سے ٹپکنا شروع کر دیتے ہیں۔جب بھی کوئی انسان جذبات کے ریلے سے گزرتا ہے اور وہ کسی جذبے کا اظہار الفاظ کے ذریعے کرنا چاہتا ہے تو وہی الفاظ لوک گیت کا روپ دھار جاتے ہیں۔اس طرح صدیوں کے عمل کے بعد یہ لوک گیت وجود میں آئے۔ان لوک گیتوں کو کبھی بھی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور نہ ہی کسی شعوری کوشش کے ذریعے نئی نسل کو یاد کرائے گئے ہیں۔یہ از خود ہی سینہ بہ سینہ ایک سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے چلے گئے ہیں اور اپنی خوبصورتی اور روانی کی بدولت لوگوں کو یاد بھی رہے ہیں۔

لوک گیتوں کے زبانی یاد کرنے اور سینہ بہ سینہ سفر کرنے کی بدولت ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ صدیوں کے سفر کے باوجود بھی ان کی زبان اور لہجے میں وہی تر و تازگی اور روانی ہے جو آج کی ترقی یافتہ زبان میں موجود ہے۔اسی لئے ان کی زبان بھی وہی ہے جو آج بولی اور سمجھی جاتی ہے۔حالانکہ ان گیتوں کی تخلیق کو صدیاں گزر گئی ہیں اور صدیوں پہلے ہندکو زبان یہ نہیں تھی جو آج کل بولی اور سمجھی جا رہی ہے۔ان لوک گیتوں کی زبان میں رد و بدل اتنی مہارت اور غیر محسوس طریقے سے ہوتا رہا کہ کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ لوک گیت پرانی لفظیات، تشبیہات اور استعاروں کو متروک جان کر جدید لسانی تصورات اور لفظیات کو اپنے اندر جذب کرتے جا رہے ہیں۔اس کا ایک فائدہ یہ

بھی ہوا کہ ان گیتوں کی زبان میں اس تبدیلی کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ صدیوں کے بعد بھی ان کی زبان وہی ہے جو آج کل مروج ہے۔ جیسے صدیوں پہلے کے اس گیت کی زبان آج بھی وہی ہے جو آج کل بولی اور سمجھی جاتی ہے:

اُڈیاں نے کونجاں......لتھیاں نے چھاواں
بازاں دیاں جائیں ملیاں کاواں

اُڈیاں نے کونجاں......لتھیاں نے بیلے
روزی دے مارے کھاندے نے ٹھیلے

اُڈیاں نے کونجاں......لتھیاں نے دوڑی
سونے دا پنجرہ لالاں دی جوڑی

لوک گیت دراصل فوک لور کا حصہ ہوتے ہیں۔فوک لور کیا ہے؟ اس کو ہم لوک ورثہ، لوک ریت یا لوک ثقافت کہہ سکتے ہیں۔اس میں وہ ساری اقدار آتی ہیں جو کسی طبقے میں اجتماعی طور پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی ہیں۔یہ باتیں اور اقدار کسی معاشرے کے افراد کے رہن سہن، تہذیب وتمدن، رسم ورواج یا ثقافت سے وابستہ ہوتی ہیں۔مطلب یہ کہ کسی معاشرے کے انسان کیسے رہتے ہیں؟ کیسے بولتے ہیں؟ کیا پہنتے ہیں؟ کیا کھاتے ہیں،؟ کیسے ہنستے ہیں؟ کیسے روتے ہیں؟ کس طرح اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں؟ دلی جذبات کا اظہار کرنے والی اشیاء اور ذرائع کو فنِ لطیف کا نام دیا جاتا ہے جس میں مصوری، سنگ تراشی، پتلی تماشے، نقالی اور لوک کہانیاں یا لوک دانش کے ذریعے وضع ہونے والے محاورے اور ضرب الامثال، بجھارتیں، گیت اور سنگیت وغیرہ شامل ہیں۔ہندکو زبان کے لوک گیتوں میں ماہیا، گیت، چاربیتہ، دوہڑا

اور قینچی زیادہ معروف ہیں۔

ماہیا

"ماہیا" ہزارہ کی لوک ثقافت اور بالخصوص ہزارہ کے لوک عوام کا ایک انمول خزانہ ہے۔یہ ایک ایسا رائج الوقت سکہ ہے جس کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور موضوعات میں پھیلاؤ اور وسعت آتی گئی۔ماہیے وہ سدا بہار پھول ہیں جو گزرے ہوئے وقت کی آنچ سے بھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ماہیا ہمارے لوک گیتوں کی وہ واحد صنف ہے جو آج بھی کچے گھروں سے لے کر پکے مکانوں تک، لہلہاتی فصلوں اور چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں سے لے کر پکی سڑکوں اور جدید طرز کے بازاروں تک یکساں مقبول ہے۔اسی لئے الٹرا ماڈرن کچن ہو یا گیلی لکڑیوں سے سلگتا دُھواں دھار چولہا،جدید ترین ڈرائنگ روم ہو یا دور افتادہ کھیت کا کنارہ، پہاڑوں میں گھری بستی ہو یا روشنیوں میں نہایا ہوا شہر، بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہانکنے والا گڈریا ہو یا زندہ دِل یاروں کی محفل، بیٹھک ہو یا چوبارہ، چوپال ہو یا آبادی سے دور کھلا میدان، سہیلیوں کی ملاقات ہو یا ہجولیوں کا جھرمٹ، کالی یخ بستہ راتیں ہوں یا تپتی شکر دوپہریں، سلگتی شامیں ہوں یا چاندنی راتیں، بہار ہو یا ساون کی گھنگور گھٹائیں، ماہیا ہر رنگ میں اور ہر جگہ موجود ہے۔

لوک ادب پر ہر ایک کا حق اور دعویٰ جائز ہے۔کیونکہ ادب کی دوامی قدروں کے حدود کا تعین کرتے وقت جب عمومیت کے اعتبار سے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو سوائے لوک گیتوں کے اور کسی بھی صنفِ سخن کو ہم عوامی ادب کا درجہ نہیں دے سکتے۔یہی وہ واحد صنف ہے جو براہِ راست عوام کے داخلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے اور

عوامی زندگی کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے۔اس اعتبار سے ہندکو زبان کی اہمیت مسلّم ہو جاتی ہے۔ہندکو زبان بولنے والے عوامی مقبولیت کے طفیل صنفِ ماہیا کو اپنا عظیم تاریخی ورثہ اور ادبی سرمایہ سمجھتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۷، صفحہ ۴۶۷ پر ایک مقالہ نگار لکھتا ہے ''.....لوگ گیت کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اسے معاشرہ یعنی گاؤں قوم یا قبیلہ(خاندان) قبول کرے۔اور اس کا یہ رجحان ہے کہ یہ جب ایک فرد سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے یا کسی دوسرے کے سامنے گایا جاتا ہے تو اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے.....''۔

ہندکو اور پنجابی میں ''ماہیا''، اردو زبان میں ''ثلاثی'' اور پشتو میں ''ٹپہ''،''لنڈی'' اور ''بگڑو'' وغیرہ کہنے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ یہ زبانیں اور اس کے بولنے والے بذاتِ خود قدیم ہیں۔اور ان سب اصنافِ سخن کے معانی .....مختصر، لنگڑا، تھپکی، تالی، زہریلا سانپ یا اس کے زہر کی اثر پذیری وغیرہ ہیں۔مثلاً ٹپہ تھپکی یا تالی کو بھی کہتے ہیں اس طرح ٹپہ میں وہ خصوصیات بھی ہیں جو تھپکی میں ہوتی ہیں اور ٹپے کی گائیکی میں تالی کا بھی حصہ ہے۔سندھی اور بلوچی میں بھی ٹپے سے ملتی جلتی اصناف موجود ہیں۔سندھی میں ''چھلو'' اور ''ڈھولو'' نام کی صنف، پوٹھوہاری ڈھولے سے کافی حد تک قریب ہے اور پوٹھوہاری ''ڈھولے'' ماہیے ہی کے رشتہ دار ہیں۔یہ اصناف نہ صرف ہیئت بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے کی مماثل ہیں۔

پروفیسر تنویر بخاری کے مطابق اس صنفِ سخن کے ہر مصرعے کا وزن...... مفعول .....مفاعیلن ......ہے۔ماہیے کو بگڑو بھی کہا جاتا ہے......یہ نام اسے یوں ملا کہ کسی زمانے میں ایک خوبصورت طوائف تھی .....گوری چٹی.....اس کا نام بگڑو تھا۔اس

کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی...... کہتے ہیں کہ وہ جب گاتی تھی تو اڑتے پرندے بھی بیٹھ جاتے تھے...... وہ جب ماہیا گاتی تھی تو اس کا رس اور لوچ اور بھی کومل اور سریلا ہو جاتا تھا۔ماہیا گاتے وقت کسی کسی جگہ وہ بڑی مہارت سے اپنے نام کا بھی استعمال کر جاتی تھی اس لئے اسے بگڑو بھی کہا جاتا ہے۔ماہیا ڈیڑھ مصرعے کا ایک رومانی گیت ہے...... اس کے اندر ایسے بھی مصرعے ملتے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں یا بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

ماہیے کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔اگر برجستہ ماہیا حسنِ اتفاق سے بنیادی جذبات کا عکاس یا سماجی زندگی کے عین مطابق اور زیادہ رواں ہو تو ایک دم سے نوکِ زبان ہو جاتا ہے اور یوں وہ ماہیا ایک زبان سے دوسری زبان تک جا پہنچتا ہے۔اس عمل میں لوک فنکاروں کا بڑا حصہ ہے۔

ماہیا گانے کی مخصوص دُھنیں ہیں۔ ماہیا زیادہ تر پہاڑی، سندھڑا، مانڈا اور سندھی بھیرویں میں گایا جاتا ہے۔بھیرویں اور بھیم پلاسی میں بھی اسے گاتے ہیں۔اس کے علاوہ جھنجھوٹی بھیرویں میں اور چناں پہاڑی میں بھی ماہیا الاپا جاتا ہے۔اور بھی بہت سی راگنیوں یا دُھنوں میں ماہیا گانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ماہیے کے مزاج سے مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے مشہور نہ ہو سکیں۔ماہیا بنیادی طور پر عورتوں کا گیت ہے لیکن اسے مردوں نے بھی اپنا لیا ہے۔اسی لئے عورتوں اور مردوں کے ماہیوں کے موضوعات اور گائیکی کے انداز میں واضح فرق ہے۔ان کی دُھنیں بھی الگ الگ ہیں۔اگر دُھن ایک ہو جائے تو بھی ان کی چال میں فرق پایا جاتا ہے۔عورتوں کی دُھنوں میں ایک قرینہ، سلیقہ اور سلجھاؤ ہے۔وہ کورس میں یا اکیلے...... ”کہرودا تال دُرت لے“ میں ڈھولک کی تھاپ پر

گاتی ہیں۔عورتوں کے ماہیے میں زیادہ تر استھائی ہوتی ہے،انترا نہیں ہوتا۔کبھی کبھار کورس میں سے ایک آواز انترا اُٹھالیتی ہے لیکن وہ جلد ہی استھائی میں شامل ہو جاتی ہے۔عورتوں کے مقابلے میں مرد حضرات زیادہ تر اکیلے ڈھولک کے بغیر "بلمپت لے" میں گاتے ہیں۔ان کی دُھنوں میں اُٹھان اور وسعت ہوتی ہے۔

ماہیا لوک گیتوں کی ایک ایسی من موہنی صنفِ سخن ہے جس نے خاص طور پر اس سرزمین میں جنم لیا اور یہ صدیوں سے یہاں مروج ہے۔ہندی شاعری میں جب بیوی اپنے محبوب شوہر کی جدائی میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی ہے اور اپنے محبوب کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتی ہے،اسی طرح ماہیے کی صنف میں بھی محبت کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔وہ اپنے ماہی کی جدائی میں بے قرار اور بے چین دکھائی دیتی ہے:

(۱) میرا ماہیا دُور گیا

زخم جدائیاں دے اُتے لونڑ بُرور گیا

(۲) بجلی ساونڑ دی

کدوں اڈیک کراں اچناں تیرے آونڑ دی

(۳) لاری آئی کشمیر بچو

آپ بیٹھ آندے او اگلاں کرو تصویر بچو

(۴) دودھ کڑ ہیا داپی ماہیا

میری دُعا اے چناں اتو جیرا تک جی ماہیا

(۵) کالے بدل پہاڑاں دے

ہر شے بھل جاندی / بول نہ وسرن یاراں دے

(۶) دو تاراں چٹل دیاں

جدوں ماہی یاد آوے / آہواں بل بل نکلدیاں

(۷) سونے دا ککل ماہیا

ذات نی ملدی چناں / مل جاندے دل ماہیا

(۸) ہتھ جوڑا پکھیاں دا

نالے میرا ماہی لگدا / نالے چانن اکھیاں دا

(۹) دل ٹٹے ہوئے نیئیں جڑ دے

عاشق تے دریا چناں / کدے موڑیاں نیئیں مڑ دے

ماہیا ہندکو زبان و ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ جب دور دیہاتوں کے لوگ، نام نہاد ترقی پسند زمانے سے نا آشنا تھے۔ ان کے دکھ، سکھ، غم، خوشیاں، دیواریں، محل، چوبارے، چوپالیں اور حجرے سانجھے تھے اور آج کی منافقت اور منافرت ان سے ابھی کوسوں دور تھی۔ وہ لوگ سارا دن کام کرتے، جب تھک جاتے یا کام ختم کر لیتے اور انہیں اپنی اپنی چوپالوں، حجروں یا ڈیروں پر آرام کرنے یا ستانے کا تھوڑا بہت وقت ملتا تو اس وقت انہیں تفریح طبع کے لئے شاعری سوجھتی اور اس شاعری میں وہ اپنا تمام تر سوز و گداز اور محبت شامل کر کے اپنے کسی بہت ہی پیارے کو مخاطب کر کے کبھی اس کا شکوہ کرتے، کبھی پیار کا اظہار کرتے اور کبھی دوسروں کو نصیحت کرتے۔ ایسی محفلوں میں ہجر، فراق اور جدائی ہی ماہیے کے عمومی موضوعات ہوتے تاہم دیگر موضوعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ اور جب اپنا اپنا کام کرتے کرتے، چلتے پھرتے، مال مویشی چراتے

ہوئے لوگ باگ ترنگ میں آ کر ماہیا الاپتے تو دور دور تک دلوں کی دھڑکنوں میں سما جاتا۔جس لے، ردھم اور سر میں وہ ''ماہیا'' الاپتے وہ دلوں میں گھر کر جاتی۔یوں ماہیے نے ہر قسم کے احساسات اور خصوصاً ہزارہ کی ثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔دراصل ماہیے کے موضوعات کی بنیاد حمد و نعت، عشق و محبت، ہجر و وصال، دکھ، درد، خوشی اور غم وغیرہ ہیں۔اس میں توصیف اور شکوے شکایت کا عنصر کچھ زیادہ ملتا ہے۔اب تو ماہیا گانے کے بجائے پڑھنے کی چیز بھی بن گئی ہے۔یوں اس کے موضوعات میں بہت زیادہ وسعت آ گئی ہے۔پیار و محبت، ہجر و وصال کے علاوہ اس میں زندگی کے عام مسائل، مشاہدات اور تجربات مثلاً فلسفہ و منطق، حمد و نعت، مذہب اور عقیدہ، معاشرہ، معیشت......سب کچھ سما گیا ہے......کچھ ماہیے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کوٹھے تے آ ماہیا

اللہ کولوں منگنے آں اجیہوی منگڑیں دی جا ماہیا

(۲) کوئی کوکا تنگ والا

اُسی اگے عرض کرو اجیہڑا نیلی چھت والا

(۳) اسمانی تارا ای

اساں گنہگاراں دا اسرکار سہارا ای

(۴) آڑو پکے ہوئے نی

دُنیا تے کرموجاں اگے دوزخ تپے ہوئے نی

(۵) شڑکاں اُتے کھو ماہیا

اگے ساڈا لہو بکیا اہن پنجر بکاؤ ماہیا

(۶) پانڑی بنی اُتوں پھریا کرو

بچ ترنُوراں دے / اگلاں سوچ کے کریا کرو

(۷) مینہ لس گیا پہاڑاں تے

اللہ سائیں فضل کرے / پردیسیاں یاراں تے

(۸) ہتھ جوڑا اکھیاں دا

میرے دروں وچ چناں / کیہ جاندئی اکھیاں دا

(۹) شیشہ ٹٹا ہویا جُڑ ویسی

بوتھا تے ڈولگیاں / دل ڈٹا ہویا مُڑ ویسی

(۱۰) بوٹا انارے دا

بند بند سوہنا / ماہیا ضلعے ہزارے دا

(۱۱) باغے بچ ڈاہ کرسی

خط میرے ماہیے دا / پڑھ کے مُنڑ وانشی

(۱۲) کونجاں نہر دیاں

خبراں کونڑ دیوے / تیرے لسدے شہر دیاں

(۱۳) تھالی بچ پان پیا

ہک تیری اکھ بدلی / سارا بدل جہان گیا

(۱۴) مٹی دی ڈِل جاواں

ہوواں ست برگا / ماہی آوے تے کِھل جاواں

ان ماہیوں میں جو خوبی اور خوبصورتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا پہلا مصرعہ یا لائن با

معنی تو ہے لیکن اس کا ربط اگلے دونوں مصرعوں سے محض قافیے اور بحر کا ہے۔اصل با معنی اگلے دو مصرعے ہی ہیں جن میں مدعا یا خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔یہی ماہیے کی خاصیت اور ہیئت ہے۔اب کچھ ہزارے کے چند معروف شعراء کے ماہیے بھی ملاحظہ کریں:

(۱) توں ںتھ کے آسہرا

ڈولی مانہہ پاسی / اہمن وڈا پہرا میرا (قتیل شفائی)

(۲) انجوں رس کے نہ جا ٹھولا

پتہ پیا لگدا اے / تیری بدلی نگاہ ٹھولا (پرواز تربیلوی)

(۳) کوئی بوٹا باڑی دا

کے تدھاں حال دساں / قسمت ماڑی دا (سلطان سکون)

(۴) دمہ کیتا ناڑے تے

مری دی میں سیر کیتی / ماہیے دے کندھاڑے تے (سلطان سکون)

(۵) بیٹھے اتے سل رکھسو

یار دی یاری نال / اہنتر میراں اپنی دل رکھسو (آصف ثاقب)

(۶) اسی پیراں کول جاندے آں

ماہیا ایل ہووے / تعویز کراندے آں (نیاز سواتی)

(۷) بیڑی ڈبسی جاتر جلسی

اکھیاں دی کھیڈ چناں / دل زخمی کر جلسی (فضل اکبر کمال)

(۸) کیوں کرناں ایں چھل ماہیا

زخم جدائیاں دے / کدوں ہوسن بل ماہیا (حیدر زمان حیدر)

(۹) چھولی دکھیاں دی خالی اے

دے دیدار چناں / اکھ میری سوالی اے (یحییٰ خالد)

(۱۰) کوئی تھاگہ کولے دا

کدے سوی نہنھ مک سکدا / حق سونٹریں ٹھولے دا (نذیر کسیلوی)

(۱۱) ہک پھیرا پا نویں آ

لوکاں کولوں چھپکنا ایں / خواباں بچ آنویں آ (محمد فرید)

(۱۲) ساری گل ای مکا چھوڑی

کِتیاں ٹیلی فون کراں / ماہیے سم بدلا چھوڑی (احمد حسین مجاہد)

(۱۳) لکھ دِلے دیاں بوداں تے

تحریک ہزارے دی / لہوڈہل گیا روڈاں تے (قاضی ناصر بختیار)

(۱۵) کوٹھے دروں آماہیا

دو درجن ماہیے نی / انہاں گاتے کو اماہیا (قاضی ناصر بختیار)

(۱۵) کتھے اکھیاں لا بیٹھے

دل پیاروندا اے / ہوش لہٹریں بھلا بیٹھے (اجمل نذیر)

گیت

ہزارہ میں "ماہیا" کے بعد گیت ہی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو اپنی بناوٹ، رس، لوچ اور عوامی احساسات و جذبات کے اظہار کا ایک بہترین وسیلہ ہونے کی بدولت یہاں کے عوام میں سب سے زیادہ مقبول رہی ہے۔ یہ گیت بھی ماہیا کی طرح کسی ایک شاعر یا کسی ایک علاقے کی ملکیت نہیں رہے...... ان پر بھی اسی طرح ہر ایک کا حق

ملکیت کا دعویٰ جائز ہے جس طرح باقی لوک ادب پر ہے۔لوک گیت تہذیب وتمدن اور انسانی جذبات و احساسات کا آئینہ وعکس ہوتے ہیں۔ ہزارے کے لوک گیتوں میں یہاں کی معاشرت، تہذیب اور تمدن سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان میں انسان کے کومل جذبوں اور بنیادی رشتوں کی مہک اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے۔یہ لوک گیت اپنی قدامت کے باوجود آج بھی تہذیبی ارتقاء کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بالکل پرانے محسوس نہیں ہوتے۔ان کی لفظیات اور بنت کاری، ہیئت اور تشبیہات بالکل مروجہ بنیادی سانچوں پر پورے اترتے ہیں۔یہ گیت پشت در پشت اور سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے ہمارے پرکھوں کی طرف سے ہمیں وراثت کے طور پر منتقل ہوئے ہیں۔یہ ہمارا لوک ورثہ ہیں۔یہ جہاں ہمارے احساسات اور جذبات کا برملا اظہار کرتے ہیں وہاں ہمارے ماحول، رسموں، رواجوں اور عام سماجی رشتوں، ہماری آپس کی محبتوں، نفرتوں اور عداوتوں کی تصاویر پیش کرتے ہیں۔یہ لوک گیت ہمارے رویوں، رہن سہن، میل ملاپ، برتاؤ اور عادات وغیرہ کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہمارے سماجی، معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی اور تہذیبی پس منظر اور تاریخ کے مطالعے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن سکتے ہیں۔

انسانی رشتوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو دو طرح کی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔رشتوں کی ایک بنیاد تو خوشی، پیار، محبت، اخلاص اور ہمدردی کی ہے اور دوسری نفرت، عداوت، حسد اور نفاق پر مبنی ہے......ان تمام انسانی رشتوں اور سماج کی تصاویر ہمیں ان گیتوں میں ملتی ہے۔

لوک گیت کو سنگیت اور سنگیت کو لوک گیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا......جیسے

گیت ازخود جنم لیتے ہیں ویسے ہی ان کی دھنیں بھی ازخود ترتیب پا جاتی ہیں۔سنگیت خیالات ،جذبات اور کیفیات کو آواز اور سروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ پیش کرتا ہے اور گیت ان خیالات، جذبات اور کیفیات کے اظہار کے لئے لفظوں کا سہارا لیتا ہے۔گویا اپنے احساسات، جذبات اور کیفیات کا مناسب آہنگ اور الفاظ کے ذریعے اظہار کرنا ہی گیت ہے۔ہزارہ میں مروج لوک گیتوں میں ٹیپ کا ایک شعر ہوتا ہے جو دراصل پورے گیت کا ماحاصل ہوتا ہے اور یہی ٹیپ کا شعر استھائی کے طور پر گایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ اسی وزن کے ماہیے، ٹپے اور دوہڑے ملا کر انترا کہا جاتا ہے مثلاً:

چٹی میری بنڑیں، کالیاں بنگاں چھڑنگ کیتا
اوکھے ویلے ٹہولے کدے نینھ سنگ کیتا
میں جانی آں میرے میرے میرا لٹھا کریندا لہر اے
چٹی میری بنڑیں، کالیاں بنگاں چھڑنگ کیتا
اوکھے ویلے ٹہولے کدے نینھ سنگ کیتا
چٹی میری بنڑیں ....

ٹپا

چلے چنے دی چانڑیں سرگی دیا تاریا لو چا دے
میرا چھلا گمایا ای او چا اے

میریا وے جی ماہیا
سیئے نال ٹھر گئی آں
تیریاں راہواں تے چناں

کھلی کھلی مر گئی آں

چٹے چنے دی چانڑیں سرگی دیا تاریا لو چا دے

میرا چھلا گمایا ای او چا اے

مختلف تقریبات کے مواقع پر خوشی کے اظہار کے لئے عموماً یہ لوک گیت گائے جاتے ہیں...... شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش، نجی تقریبات، عوامی تفریح اور اجتماعات کے مواقع پر ذاتی اور اجتماعی خوشی کے اظہار کے لئے جو گیت گائے جاتے ہیں ان کی چند جھلکیاں دیکھیں:

میرے سر تا کالا چیڑا

توں جی پہنڑاں دیا ویرا

گڈیاں والیا...... کہڑی قلی پئی ہوندی آ

پنڈیوں چڑھ آئیں، موڑ سہی پئی ہوندی آ

ٹوں مُجل ویرا میں آئی وے

میری لاڈلی جیہی پہرجائی وے

ویرا خانا سنگیاں ئل کوہ مری گیا

کھول کے گانا بنھ سونے دی کہڑی گیا

میں کوٹھیوں کوٹھیوں دوڑاں

دس تلی تے بدلہ موڑاں

اُچیاں ٹھہریاں تے...... پٹھانڑاں لائے ڈیرے

گنڈیاں والے دے ڈبیاں بچ آئے سہرے

میں آخاں کہ نہ آخاں
پکیاں خانپورے دیاں داکھاں
سٹیا جالا نکے پکھیرو اُڑ گئے نی
کہن کے رفلاں ویر جنجاں نال ٹُر گئے نی

ایک اور رنگ دیکھیں:

تیری سس دا چلواں پھیرواں
جس پتر جمایا تیرھواں
پنڈیوں آئی لاری مار گلے کھلو گئی آ
آ کے مل ماہیا، ساڈی بدلی ہو گئی آ
ٹُدھ کندھاں توں ماری تیلی
وے میں ہو گئی ساوی پیلی
جلاں بزارے آں اوتھے تھال کٹورے نی
گنڈھیاں والے دے لکھ پتیئے سوہرے نی
تیری ماؤ دا چلڑاں کیسا
جس پتر جمایا میہسا
میریا ماہیا ہک بُوہا بند کر باری دا
اللہ تدھاں ممبر کرے اس قوماں ساری دا

لوک ثقافت میں عیدین اور شادی کی تقریب ہر ایک کے لئے خوشی کے اظہار کا موقع فراہم کرتی ہیں۔شادی بیاہ کے موقع پر نوجوان لڑکیاں ایک دائرے کی شکل میں

بیٹھ کریا کھڑی ہو کر جب ڈھولک بجاتی ہیں اور ایک آہنگ کے ساتھ یہ گیت گاتی ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے:

ہار پھلاں دے کہ مزیدار پھلاں دے
پھلاں جوگی تیری جان پانواں ہار پھلاں دے
پھلاں پہری چنگیر بچ کالی لیر
پاروں کہوڑی تے چڑھ آیا میرا ویر
ہار پھلاں دے کہ مزیدار پھلاں دے
پھلاں جوگی تیری جان پانواں ہار پھلاں دے
تیرا متھہ چٹا تدھاں پانواں ٹکہ
تیرے بانکا جیہا ماہی اساں روندا ڈٹھا
ہار پھلاں دے کہ مزیدار پھلاں دے
پھلاں جوگی تیری جان پانواں ہار پھلاں
وے تیرے ہتھ سوہنڑیں تے لوانواں گجرے
اُس گجرے دے ہوونڑ پھل سجرے
ہار پھلاں دے کہ مزیدار پھلاں دے
پھلاں جوگی تیری جان پانواں ہار پھلاں
تیرے سوہنڑے پیراں تے لوانواں مہندی
ڈاہڈی زلفاں دی لٹ کھل کھل پیندی
ہار پھلاں دے کہ مزیدار پھلاں دے

پھلاں جوگی تیری جان پانواں ہار پھلاں

ہزارہ میں ایک اور مقبول لوک گیت "سرگی دیا تاریا" کے نام سے ہے۔ یہ گیت شادیوں کی تقاریب کے علاوہ بھی یہاں بہت مقبول ہے...... اس گیت میں بھی وہی انداز اپنایا گیا ہے جو عموماً ماہیا گانے کا مروجہ انداز بیان ہے۔ ایک بند دیکھیں:

چٹے چنے دی چانڑنی......
سرگی دیا تاریا، رت آنا ایں
سدھا تیر کلیجے بچ لانا ایں
سرگی دیا تاریا، لو چا دے
میرا چھلا گمایا ای او چا دے
چٹے چنے دی چانڑنی......

ہزارہ میں اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ ہندکو ادب بھی پھلتا پھولتا رہا...... یہاں کے شعراء نے نہ صرف اردو زبان کو اپنے افکار سے سرسبزی و شادابی سے ہمکنار کیا بلکہ اپنی مادری زبان کے دامن میں بھی اپنی فکر کے موتی جمع کیے...... عبدالغفور ملک کا ایک گیت دیکھیں جس میں روایتی رنگ زیادہ نمایاں ہے:

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُل
آ! سامنڑے آ کے ہَس جُل   یا دیخ کے اندر نَس جُل
یا دِل بچ آ کے تُھس جُل   یا دِل دا چین وی کَھس جُل

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُجل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُجل

آ!دل دی ہونس پُچکا جُجل   آ! اَکھ نل اَکھ مِلا جُجل
یا چھنگوی دِل دی کُھا جُجل   یا آ کے دِل نل کس جُجل

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُجل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُجل

آ! رُٹھڑے یار مَنا جُجل   آ! قِصّے نویں جگا جُجل
آ! دل داحال سُنوا جُجل   کجھ سیت تے اتھے ٹھس جُجل

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُجل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُجل

کجھ رنج کہن شرم جُدائیاں دا   کجھ اڑیاں بے پروائیاں دا
کجھ عشق دیاں کوتاہیاں دا   کجھ ہجر دا کہن کے چَس جُجل

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُجل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُجل

آ! ملک دیاں فریاداں سنڑ   آ! ہجر دیاں روداداں سنڑ
ملی قید دیاں میعاداں سنڑ   آ! فِر زُلفاں نل ڈس جُجل

آ! اَج دو اَکھیاں وَس جُجل
اَج بدلاں وانگڑ بَس جُجل

ڈاکٹرارشادشاکراعوان صاحب کاتعلق ہزارہ کےعلاقہ بفہ سے ہے......کیا

خوبصورت گیت لکھا ہے......ذرا بالائی ہزارہ کی زبان کا رس، لوچ اور آہنگ بھی ملاحظہ کیجیے:

ٹُدھ لِکھ لکھ بھیجیاں چٹھیاں
دِل ٹھنڈا تے اَکھیاں مِٹھیاں
......ماہیا آپ آویں

......(۱)......

آپ آویں بنڈاں پتاسے چھکیراں پُہر پُہر کے
رکی اُس نال یاری لائی
دِل ساڑ گیا چن ماہی
......اَکھ ترہائی اے
میں رُسیا ٹہول مناواں منتاں کر کر کے
آپ آویں بنڈاں پتاسے چھکیراں بہر بہر کے

......(۲)......

آپ آویں دُکھڑے رولاں راتی بہہ بہہ کے
راہ اُس دی ہوئی اُڈیکاں
کہر سارا مارے چیکاں
......لمّی جدائی اے
میں حرف نہ مونہوں بولاں صدمے سہہ سہہ کے
آپ آویں دُکھڑے رولاں راتی بہہ بہہ کے

......(۳)......

آپ آویں بنڑے دوائی درد جدائی دا
خط لِکھ لِکھ بھیجے بالم
دِل منّے نہ اُس کوں ظالم
......بے پروائی اے

چن مٹھوا اپڑاں مائی دیر نہ لائی دا
آپ آویں بنڑے دوائی درد جدائی دا
ٹدھ لِکھ بھیجیاں چٹھیاں
دِل ٹھنڈا تے اَکھیاں مِٹھیاں

......ماہیا آپ آویں

پروفیسر یحییٰ خالد اردو اور ہندکو زبان میں یکساں قدرت رکھنے والے شاعر ہیں ان ایک خوبصورت ہندکو گیت دیکھیں:

مری دل دی تا ہلی پا کہن پینگاں پیاردیاں
میں نوکر، کولی، خادم اپڑیں یار دی آں

بنڑ ہرنی چھلاں پاواں، زور جوانی دا
کے ڈھڈا تے موہنہ زور ہے، دور جوانی دا

تیرے راہ بچ کوئل بنڑ کے کوکاں ماردی آں
میں نوکر، کولی، خادم اپڑیں یار دی آں

پا کپڑے بیٹھی بال سوارے، آویں نا
میرے دل دے آل دوالے پھیرے پاویں نا

مانہہ اپڑیں رنگ بچ رنگ کہن یار پکاردی آں
میں نوکر، کولی، خادم اپڑیں یار دی آں

در دل دا کھول کے بیٹھی، ڈیرا لا آ کے
میں درداں ماری دا کچھ درد ونڈا آ کے

پئی گھنگیاں نالوں رو رو وازاں ماردی آں
میں نوکر، کولی، خادم اپڑیں یار دی آں
مری دل دی نا ہلی پا کہن پینگاں پیاردیاں
میں نوکر، کولی، خادم اپڑیں یار دی آں

ہزارہ کے لوک گیتوں میں صوفیانہ رنگ کی بھی گہری چھاپ ملتی ہے......روایتی لوک گیتوں کے علاوہ جدید عہد کے شعراء مثلاً پروفیسر محمد فرید اور نذیر حسین شاہ کسیلوی، جانِ عالم وغیرہ بھی اس رنگ میں بہت خوبصورت گیت نگاری کر رہے ہیں......جانِ عالم کا ایک گیت دیکھیں:

مڑا یار فِر اَج نیں آندا
دلدار فِر اَج نیں آندا
سکھی ڈھول بجاو......نچو، کھمر پاؤ
رتا جوڑا لاؤ......مک بھوئی بڑاؤ
مڑا ملدا او نیں مکاندا
مڑا یار فِر اَج نیں آندا
دلدار فِر اَج نیں آندا
من ٹھار فِر اَج نیں آندا
مڑا یار فِر اَج نیں آندا
اے لگیا رہووے......او کدے نہ آووے
راہ دیکھدی رہواں......اکھ کدے نہ سیووے

دل سوچ دھمالاں پاندا

مڑا یار رِ فر اَج نیں آندا

نڑ یار فِر اَج نیں آندا

سوہنڑاں یار فِر اَج نیں آندا

دلدار رِفر اَج نیں آندا

حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے اندر شاعر کے وہ تمام ظاہری و باطنی جذبات و احساسات مصور ہو جاتے ہیں جو اس کی اپنی سرزمین سے لازوال محبت کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے......وطن کی محبت سے حوالے سے جعفر سیّد کا ایک خوبصورت گیت ملاحظہ فرمائیں:

ایہہ تہرتی پھُل گُلل ساری ہے

دِل جان بھی اِس توں واری ہے

ایہہ تہرتی ٹھنڈیاں چھاواں دی　　آزادی گھلیاں ساہواں دی

ایثار یقین و وفاواں دی　　ہر خوبی اس وچ ماواں دی

ہر شے توں بدھ کے پیاری ہے

دل جان بی اس توں واری ہے

رکھوالی دین ایمان دی اے　　تاریخ گواہ جہان دی اے

ہک نعمت رب رحمٰن دی اے　　ایہہ تہرتی پاکستان دی اے

دَنگ اِس تے دُنیا ساری اے

دل جان بی اِس توں واری ہے

دو صدیاں دے حالاتاں دی   قسمت دی ہنیری راتاں دی
ہے موت دُکھی اوقاتاں دی   ایہہ تہرتی پیار سوغاتاں دی
اِس ڈُبی بیڑی تاری اے
دل جان بی اِس توں واری اے
آباد کروڑواں سال رہوے   آزاد سدا خوشحال رہوے
ایہہ زر نال مالا مال رہوے   خوشنودی رب دی نال رہوے
ایہہ اللہ اَگے زاری اے
دل جان بی اِس توں واری اے

چاربیتہ

ہزارہ کی تمام لوک اصنافِ سخن میں قدامت کے لحاظ سے بھی اور ہیئت کے لحاظ سے بھی چاربیتہ وہ واحد صنفِ سخن ہے جس پر اہلِ ہزارہ بلا مبالغہ فخر کر سکتے ہیں...... اس صنفِ سخن میں موضوعات کی رنگا رنگی اور ہیئت کی ہما ہمی اتنی ہمہ جہت ہے جو کسی دوسری صنف میں نہیں ۔چاربیتہ میں حمد ونعت کے علاوہ عشق ومحبت،ہجر ووصال،رزمیہ بزمیہ، معاش و معاشرت،طنز ومزاح غرض ہر قسم کے مضوعات شامل ہوتے ہیں ۔چار بیتہ کی مزید دو طرح سے تقسیم کی جاتی ہے......حمدیہ ونعتیہ چاربیتوں کو''حقانی''اور حسن و عشق کے معاملات سے معمور چاربیتوں کو''مجازی'' کہتے ہیں ۔ ہندکو زبان میں چاربیتہ مخمس،مسدس اور مثلث کی ہیت میں بھی ملتا ہے ۔تاہم چاربیتہ کی ہیئت کے بارے میں پروفیسر صوفی عبدالرشید صاحب لکھتے ہیں......''(ہندکو سے ترجمہ)......چار بیتے کے نام سے شاید لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صنف چار بیت یا چار اشعار پر مشتمل ہے ۔یہ

بات نہیں ، یہ ایک طویل نظم کی طرح ہے جس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں اسی طرح اس کی ہیئت یا شکل بھی متعین نہیں ۔شعرا اس میں بندوں کا اہتمام کر کے واقعے کے کسی پہلو کا تأثر بھی ابھار سکتے ہیں اور اس سے آزاد رہ کر بھی اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ بات بھی ضروری ہے کہ چاربیتہ اپنے مخصوص وزن میں ہی کہا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئیے کہ یہ گانے والی چیز ہے جس کے ساتھ دف کا استعمال ضروری ہے۔''

پروفیسر بشیر احمد سوز ''ہزارہ میں ہندکو زبان و ادب کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں ..... ''چاربیتہ'' ایک خاص وزن رکھتا ہے لیکن ہیئت کے اعتبار سے اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں ۔اس میں اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں اور مضامین کی بھی کوئی بندش نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چاربیتے کے ہر بند میں سات مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے دو مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں جبکہ تیسرا اور چوتھا مصرعہ آپس میں ہم وزن ہوتا ہے۔جبکہ پانچویں اور چھٹے مصرعے کا آپس میں وزن برابر ہوتا ہے۔پہلا مصرع ٹیپ کا مصرعہ کہلاتا ہے جو ہر بند کے آخر میں بار بار آتا ہے۔ ہر بند ایک اکائی یا یونٹ کی طرح ہوتا ہے۔ ساتواں مصرعہ چھٹے مصرعے کے ساتھ مل کر تال سُر میں بھی اضافہ کرتا ہے اور اس بند کی تکمیل کا بھی پتہ دیتا ہے.....ہندکو میں اس کے ہر بند کو ''کلی'' کہا جاتا ہے''۔

رضا ہمدانی کے بقول''.....چاربیتے کا مطلع ''سُر'' یا بند چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور پھر چار چار مصرعوں کی کئی کلیاں ہوتی ہیں جسے پشتو میں ''کڑی'' اور ہندکو میں ''کلی'' کہا جاتا ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کلی چار سے زیادہ مصرعے بھی رکھتی ہے ۔تاہم عام طور پر مطلع یا آغاز کے مصرعے چار ہی ہوتے ہیں اور پورے چاربیتے کی

بنیادانہی چار مصرعوں پر رکھی جاتی ہےاور مطلع کےبعد جہاں بھی کلی ختم ہو وہاں پر مطلع یا سُر کو دہرایا جاتا ہے لیکن اس آغاز کا تعلق موضوع کے ساتھ لازمی ہے۔ شاعر اپنے خیالات کے صحرا میں دُور دُور تک گھوم پھر کر جب واپس آتا ہے تو کلی کے اختتام پر آغازِ مطلع کو اس طرح پیوست کرتا ہے جیسے اس کے بغیر کلی کی تکمیل ناممکن ہو یہی ارتباط کلی کی بندش کو مضبوط کرتا ہے اور کلام میں زور پیدا کر کے سامع کو چونکا دیتا ہے۔"

مختار علی نیّر کے کا کہنا ہے کہ "چار بیتہ مجموعی طور پر ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں بیشمار اوزان ہمیں ملتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ شاعر منہ کا ذائقہ بدلتے ہی صنف کی تبدیلی عمل میں لاتا ہے یا خاص موضوعات کے لیے خاص وزن یا بحر کا انتخاب کرتا ہے۔ چار بیتے میں یہی خوبی عہد قدیم سے چلی آرہی ہے کہ شاعر نے جب چاہا بحر بدل دی اور مشقِ سخن کرنے لگا اور پھر ایک خاص تکنیک کے ذریعے اسے پھر چار بیتہ بھی کہا جانے لگا اس طرح چار بیتے میں اتنے مزے موجود تھے کہ شاعر کبھی دل برداشتہ نہ ہوتا اور بحر بدل بدل کر مشقِ سخن کرتا رہتا اور یوں صدیوں چار بیتہ ہندکو زبان وادب پر چھایا رہا۔"

چار بیتہ اہلِ ہزارہ کے مزاج، ماحول اور معاشرت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے...... یہ عام سماجی اجتماعوں میں بھی گایا جاتا ہے اور خالص مذہبی مجالس میں بھی...... شادی بیاہ کے موقع پر بھی یہ پیش کیا جاتا ہے اور دیگر تفریحی تقریبات میں بھی مقبول ہے۔ اس میں ابلاغ اور متنوع موضوعات کی رنگارنگی کی اتنی زیادہ گنجائش ہے کہ ہر مزاج اور موڈ کے فرد کے لئے سازگار اشعار ملتے ہیں۔ چار بیتہ پشتو زبان میں بھی ملتا ہے لیکن اس کی ہزارہ میں عوامی مقبولیت اور دستیاب مواد کے غیر جانبدارانہ تنقیدی و تحقیقی جائزے کے بعد یہ بات یقینی طور پر صحیح اور درست ہے کہ چار بیتہ ہندکو سے پشتو زبان میں منتقل

ہوا...... کیونکہ اس میں شامل تشبیہات ، استعارات اور ہیئتی تجربات اس بات کو مزید تقویت دیتے ہیں کہ پشتو زبان میں اتنے تکنیکی سطح کے تجربات کسی بھی صنف سخن میں موجود نہیں اور پشتو زبان میں چار بیتہ کا وہ مخصوص آہنگ اور لوچ نہیں ملتا جو ہندکو زبان میں مروجہ چاربیتوں کی اساس ہے۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس صنفِ سخن کی مقبولیت پشتو زبان میں بھی "ٹپہ" کو چھوڑ کر باقی تمام اصناف کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔

جیسے پہلے بھی اظہار کیا جا چکا ہے چار بیتہ مذہبی تقریبات،عوامی تفریحات اور اجتماعات کے مواقع پر گایا جاتا ہے...... اس میں مذہبی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی روایات کا اظہار انتہائی خوبصورتی سے کیا جاتا ہے۔چار بیتہ پہاڑی ڈھلانوں، وسیع و عریض میدانوں، چراگاہوں اور کچی پکی پگڈنڈیوں پر پھرنے والے لوگ بھی گاتے ہیں اور سجے سجائے حجروں، گھروں اور میلوں ٹھیلوں یا عوامی اجتماعات وتقریبات میں بھی گایا جاتا ہے جس کے لئے سازندوں کی ایک پوری جماعت موجود ہوتی ہے...... گانے والا کھڑے ہو کر یا کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر پورے انہاک اور توجہ سے جب اسے اپنے آہنگ اور ترنم سے پڑھتا ہے تو پوری محفل پر وجد چھا جاتا ہے...... خوشی اور طمانیت کا وہ احساس جو کسی بھی خاص تقریب کی خوبصورتی کو چار چاند لگا سکتا ہے وہ چار بیتہ گانے والے کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔

حیدر زمان حیدر اپنی کتاب "مشال" میں لکھتے ہیں کہ "......(ہندکو سے ترجمہ)...... چار بیتہ ہندکو زبان کی بہت پرانی اور قدیم صنفِ سخن ہے۔اس کی ایک مخصوص تکنیک ہے اور یہ آج بھی اپنی اسی خالص اور اصل حالت میں لکھا جاتا ہے۔اس صنف سخن کا تعلق خالصتاً صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) اور پنجاب کے علاقے اٹک اور

چھچھ ہزارہ سے ہے، جو اپنا ایک خاص تعلق، سماجی اور ثقافتی پس منظر رکھتا ہے۔"

ہندکو زبان میں دستیاب چار بیتوں میں سے قدیم ترین چار بیتہ "خادی خان" کا ملتا ہے۔ جو اپنی شعلہ نوائی کی وجہ سے بھی بہت مشہور تھے:

میں ڈُٹھی محبوب، سیاں ساریاں دی سردار
پاندی گل پھلاں دے ہار
جیونکر بلنی ایں مشال.....ویکھ دیں نال ہویاں ظہیر
لگدا چھاتی دے وچ تیر
مشالاں نالوں بلدی اے.....جدوں سامنڑیں آکے کھلدی اے
دل تیراں دے نال سلدی اے
کل دیکھدے نی ترٹور.....تربوراں کیتا تنگ
میرا کوئی مینھ کردا سنگ
پلہ پا کے ٹُلبے لہنگ.....ہڑ کے ہو گیاں انگار
سیاں ساریاں دی سردار
پاندی گل پھلاں دے ہار

ایک اور چار بیتہ دیکھیں جو ارسلّہ خان سے منسوب ہے:

تیرے سر جیڑا حلوان دا.....کئی ٹھیک جلے مشال
میں نوکر تیری جان دا.....منیں عاشقاں دا سوال
تیرے سر جیڑا حلوان دا.....بس کئی مزے دی ڈول
میں آیاں تیری غرضی، اس مونہہ تھیں مٹھڑا بول

مَن عاشقاں دا سوال، سینے دیاں تنڑیاں کھول

اگے سیل اے یاغستان دا..... تیرے سر چیڑا حلوان دا

یاغستانے دے بچوں آیاں، توں سوہنڑیں ایں بلبل

شہ گندلاں والیاں بانہواں تیریاں، سوہنڑا تیرا اپھل

زر او ہڈیاں دے نال دیواں، تیرا لکھ روپیہ مُل

پٹھسے نہ ہوندا ای کنگال..... منیں عاشقاں دا سوال

عبدالغفور ملک مرحوم (۱۹۲۳ء-۲۰۰۸ء) کا ایک چار بیتہ ملاحظہ فرمائیں جس میں سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی آمد اور بچپن کے حوالے سے کتنا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے:

مکی رات غماں دی کالی ہو گئی دُنیا اُتے لو

چوآں کنڈاں اُتے پہنچی مکی مدنیؐ دی خوشبو

اوہ مکی مدنی سوہنڑا گھر بچ عبداللہ دے آیا

مائی بی بی آمنہ جنہاں جھولی دے بچ پایا

دائی حلیمہ جنہاں اپڑی چھاتی دُدھ پلایا

عبدالمطلب ناں محمدؐ جن دا آپ رکھایا

احمدؐ ناں خدا نے رکھیا، اُن جیہا ہور نہ کو

چوآں کنڈاں اُتے پہنچی مکی مدنیؐ دی خوشبو

آصف ثاقب ہزارہ کے ایک ہمہ جہت اور صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ ان کا ایک چار بیتہ دیکھیں جس میں اپنے وطن کی مٹی سے اپنی محبتوں کا اظہار ایک خاص انداز

میں کیا گیا ہے:

ڈوہلاں اس تے خون جگر دا کر کے کپڑ چھاݨ
ذرہ ذرہ چمکاں مارے اس تھرتی دا ماݨ
دل ارمانی اندر لشکے درد تمنا شوق
اس مٹی توں صدقے ہووے تیرا میرا ہاݨ
اللہ جاݨیں جاݨ اے سنگیا، اللہ جاݨیں جاݨ

حرف دعائیاں پڑھ کے ڑسن فرری شام
سر تے قائم رہوے اللہ اس ماؤ دی چھام
پاک وطن دی مٹی جوگے اکھاں مٹھڑے بول
بیٹھ چناری ستا رہواں عشق دی چادر تاݨ
اللہ جیڑیں جاݨ اے سنگیا، اللہ جاݨیں جاݨ

بسن گلیاں سبز زمیناں بسن اس دے چوک
آون جلن ہسدے بسدے شہر گراں دے لوک
سوچدا رہواں کس طرح ہوسی شہر گراں دا میل
مہر خلوص توں میرے دل دے ہوسیں تو انجاݨ
اللہ جاݨیں جاݨ اے سنگیا، اللہ جاݨیں جاݨ

نیاز سواتی مرحوم کا ایک چاربیتہ دیکھیں جو ہیئت اور تجربے کے لحاظ سے انوکھا اور انتہائی خوبصورت ہے۔ یہ چاربیتہ سادگی، سلاست اور روانی میں اپنی مثال آپ ہے:

دیساں میں نذر نیاز...... بنڈساں لوکاں بچ مٹھائی

جدوں مڑ کے آسی ماہی

یاری چنگی توڑ نبھائی.....پھیرا فر نہ مڑ کے پائی
اگ ہجر دی او لائی.....جیہڑی اوہ بجھ دی لکھ بجھائی

مڑ کے آیا نہ ہر جائی

روندی رہندی آں زار و زار.....ہڑ کے ہوگئی آں انگار
کوئی میرا نیئں غم خوار.....دشمن بن گئی اے خدائی

مڑ کے آیا نہ ہر جائی

سُک کے ہو گئی آں چم.....کر نہ سکدی کوئی وی کم
ہو نہ سکدی میں بر دم.....مانہہ لگ گئی اے ترسائی

مڑ کے آیا نہ ہر جائی

مُک جاسی ایہہ جدائی.....مل سی غم کولوں رہائی
دیندے دِل میرا گواہی.....رہساں فر اسی ہک جائی

جدوں مُڑ کے آسی ماہی

کیتی کیوں اے بے وفائی.....کیتی کیوں اے لا پرواہی
پچھ ساں دیر کی اتنی لائی.....کرساں اس دے نل لڑائی

جدوں مڑ کے آسی ماہی

سارا مک ویسی خفقان.....پاسی سکھ ایہہ میری جان
مشکل ہر ہوسی آسان.....بجسی خوشیاں دی شہنائی

جدوں مڑ کے آسی ماہی

قاضی ناصر بخت یار خان ہزارہ کے شعرا میں ایک خاص اختصاص یہ رکھتے ہیں کہ وہ شعر و عروض پر دسترس رکھنے والے شاعر ہیں۔ان کا ایک چار بیتہ دیکھیں:

مٹھڑ میرے شاگردا ہندکو میری اے زبان
اس آں دبدے حکمران، ہوسی بوہوں بڈا نقصان
گندھارا دی تہذیب اے پہنویں کنگ ہووے اشوک
اس دا رغدے آہسے شوق
ایہہ بولی خاص ہزارے دی، گل پکی اے دو ٹوک
اس آں بولن سارے لوک
اس آں بولے کوئی باشندہ اس دا ہک ایہا روک
جڑا ہووے جی باذوق
میری ایہہ پہچان اس تے جان ہووے قربان
مٹھڑ میرے شاگردا ہندکو میری اے جان

حرفی

ہزارہ کے لوک ادب میں ایک اور صنفِ سخن ’’حرفی‘‘ بے حد معروف ہے......حرفی عموماً رباعی کی طرح چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس میں موضوعات کا تنوع بہت وسیع و عریض ہے۔ رباعی کے برخلاف اس میں بحرِ طویل استعمال کی جاتی ہے اور پوری نظم مختلف بندوں پر مشتمل ہوتی ہے تاہم ہر بند میں اشعار کی تعداد برابر برابر ہوتی ہے۔حرفی میں سنجیدہ فکری مسائل و معاملات شامل کیے ہیں ......حمد و نعت ،حسن و عشق ،ہجر و فراق اور تصوف کے

مسائل کے بیان کے لئے یہ صنف انتہائی موزوں اور مستعمل ہے۔ہندکو زبان میں سائیں احمد علی پشوری، آغا محمد جوش، استاد محمد رمضان اور استاد غلام رسول گھائل نے حرفی میں ایک بلند مقام حاصل کیا...... جدید میڈیا میسر آنے کے بعد اس میں طنز ومزاح کو بھی شامل کرلیا گیا ہے...... ہزارہ میں عبدالغفور ملک، پرواز تربیلوی، نذیر کسیلوی، پروفیسر یحیٰی خالد، پروفیسر محمد فرید اجمل نذیر، قاضی ناصر بخت یار خان وغیرہ نے حرفیاں لکھی ہیں...... تاہم ابھی تک اس صنف میں باقاعدگی کے لکھنے والوں کی انتہائی کمی محسوس ہوتی ہے۔ چند حرفیاں دیکھیں:

الف !اللہ دے ناں توں شروع کراں جیہڑا بخشنویں والا رحیم سائیں
ساری حمد ثناء اُسے ذات جوگی جیہڑی ذات اے سب توں عظیم سائیں
اوہ ای مالک اے حرفاں تے لفظاں دا، الف لام اس دے، اسدا میم سائیں
ہتھ بنھ کے خالدؔا آکھ کھلتا، منگے لفظاں دا خیر اے کریم سائیں

(پروفیسر یحیٰی خالد)

باغاں دے وچ بہار آئی، پھل کِھل گئے نے گلزاراں وچ
موہنہ پھلاں دا بلبل چم دے نے اِڈ دیاں پھردیاں نے کونجاں ڈاراں وچ
نویں سرے توں قول اقرار ہوئے ملے مدے دے بچھڑیاں یاراں وچ
پھٹ ملکؔ دے دل دے ہرے ہوئے باہدے ہو گئے ہور ازاراں وچ

(عبدالغفور ملک)

فکر مانہہ ایہہ دن رات رہندی سوہنڑا یار ناراض نہ ہو ونجے
میرے پیار آں لیک نہ لگ جُلے ہوس طمع دارز نہ ہو ونجے

ہر دَر تیرے تے نگوں رہوے قضا عشق نماز نہ ہو ونجے
ملکؔ نیکیاں کر، در رحماں دا اے کھلے دا باز نہ ہو ونجے

(عبدالغفور ملک)

میرے پیر زمیں اتے ٹکیں ٹکدے، خط ماہیے دا جدوں مل جاندا
ٹھنڈ سینے دے وچ پے جلدی، دل نال خوشی دے کھِل کھلدا
خط ماہیے دا جدوں پڑھنی آں، پُھل جلدے فکر تے غم سارے
بیڑا سدھراں دا جیوں خوشیاں دے وگدے دریا وچ ٹھِل کھلدا

(پرواز تربیلوی)

کدے کریں نہ انہاں تے نظر لوہکی، پہاویں دسدا حال حقیر جندا
کریں ادب دے نال سلام انہا میلا چغہ ہووے لیر ولیر جندا
انہاں وچ کئی اللہ دے ولی ہوندے اُتوں دسدا حال فقیر جندا
جاواں انہاں توں میں پرؔواز صدقے اُچا ظرف تے پاک ضمیر جندا

(پرواز تربیلوی)

میرا پاک مولا تعریف جوگا، طاقت اس دی اے سارے جہان اندر
ہک لبڑا مٹی دا بت تے دیخ، کے کجھ بیٹھا اس مکان اندر
نہ کجھ توں کجھ خمیر ہویا، شان اسدی اے تیری اٹھان اندر
.... مدد اسدی اے امن طوفان اندر

(سید نذیر حسین شاہ کیسلوی)

ر.....توں رات منہاں ایجی جہاں اُتے، جس تے زور منہ چلدا سویریاں دا
کدے چیز دی اپڑیں سنبھال کریں، فر خوف منہ رہندا لٹیریاں دا
اوہ باغ بڑا خوش نصیب ہوندے، جے درماند منہ ہالی مزیریاں دا
تیری جان جگر تیرا دیس ناصرؔ، ایہہ فرمان اے بڈیاں بڈیریاں دا

(قاضی ناصر بخت یار خان)

قینچی

کو گہ ہزارہ میں کافی اور دوہڑہ (دو بیتے) جیسی لوک اصناف بھی موجود ہیں لیکن ان اصناف کو لوک گیتوں میں شمار کرنا محلِ نظر ہے..... کیونکہ یہ دونوں اصناف یقینی طور پر پنجابی زبان و ادب سے یہاں منتقل ہوئی ہیں اس لئے انہیں ہزارہ کی ثقافتی تاریخ میں شامل کرنا مناسب نہیں ..... البتہ قینچی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو ہزارہ اور بالخصوص کاغان و ناران کے علاقے میں انتہائی مقبول صنف ہے..... یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو اپنے آہنگ، لہجہ، بحور و اوزان کے لحاظ سے تمام اصناف سے مختلف ہے..... یہ صنفِ سخن ہزارہ اور آزاد کشمیر میں یکساں طور پر مقبول ہے..... درشی اور مُنشی کی داستانِ محبت کے نتیجے میں یہ لوک صنف یہاں کے لوگوں میں مروج ہوئی اور اس نے وادیٔ کاغان اور ہزارہ میں مقبولیت حاصل کی..... کاغان و ناران، مظفر آباد، اپر دیر اور سوات کی وادیوں میں اس کی گونج ہر جگہ سنائی دیتی ہے..... قینچی کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

لگی قینچی دلے دی.....دل ڈھڈا تنگ اے
کولی ماراں رکھیاں کی، اللہ ماڑے سنگ اے
لگی قینچی ....

درشی دے بنڑاں بچ پکیا منڑیرا
منشی کو نہ مارو منشی اے میرا

گی قینچی ....

ورشی دے بناں بچ آئی برسات
گیو میرا منشی رووا‌ں دن رات
گی قینچی ....

ورشی دے بناں بچ چڑیاں کو ڈار
گیو میرا منشی رووا‌ں زار و زار
گی قینچی ....

ورشی دے بناں بچ گھگیاں کو جوڑو
گیو میرا منشی، دُکھ نئ تھوڑو
گی قینچی ....

ورشی دے بناں بچ پکیاں نے ہاڑیاں
منشی کو ماریا نال نے کلہاڑیاں
گی قینچی ....

آصف ثاقب نے اس صفِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے قیامت خیز زلزلہ کے حوالے سے زلزلہ قینچی دیکھیں:

گلی قینچی ولا دی ارے دل ڈاہڈا تنگ اے
کولی مارا رکھا کو اللہ ماڑھا سنگ اے
ورشی دے بنا بچ اڈدیاں چھائیاں
ظلمی پکھما سنڑ پٹیاں نے جائیاں
گی قینچی ولا دی
ورشی دے بنڑاں بچ آئیاں تماشاں
ملبے تے ملبے تے لاشاں تے لاشاں

ٹکی قینچی ولا دی

درشی دے بناں بچ پھٹ پئیاں پڑیاں
سرا اُتے سریے تھ بیٹھے اُتے کڑیاں

درشی دے بناں بچ

درشی دے جنگلاں دے اڈ گئے پکھرو
مک گئے نے رو رو کے ثاقبؔ دے اتھرو

ٹکی قینچی ولا دی

درشی دے بنڑاں بچ غمیاں ای ملیاں
ٹہہ گئے نے ٹہارے تے پھٹ گئیاں زمیاں

ٹکی قینچی ولا دی

ہزارہ کے ایک اور معروف شاعر قاضی ناصر بخت یار خان بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے......ذرا ان کا رنگ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ٹکی قینچی کلیجے اُتے، روندی اے حلیمہ
رحم کریں مشی تے، میریا رحیمہ
ٹکی لوئی درشی تے ویراں مار سٹیا
کے گلہ کراں تقدیراں مار سٹیا
نظر کرم دی کریں وے کریما
ٹکی قینچی..................

ستا لبھیا مشی کہ اکیاں منہ کھولدا
رُسیا دا ماہی، جنجو سروں ہی منہ بولدا
میں کس نال گلاں کراں میریا کریمہ
ٹکی قینچی..................

انجو رتّے پھلاں بچ مشی دا خون اے
جنجو بشکارے بچ قینچی دے نون اے
کواڑیاں تے بُت چُٹ چُٹ کیتا قیمہ
گئی قینچی....................

گیا اتھوں لاہوراں کہ پاویں اوپشوراں
اتھوں وعدہ کر کے تے گیا اے راجوراں
آنزساں میں تیرے جوگا چٹا پشمینہ
گئی قینچی....................

دوہڑہ

دوہڑہ اور دو بیتا ہزارہ کے لوک گیتوں کی ایک معروف صنفِ سخن ہے جو یہاں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کے طور پر مروج ہے۔ اس میں بھی بنیادی موضوع انسان اور انسانی کے تہذیبی و ثقافتی احساسات کی ترجمانی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی کے گرد گھومتے ہیں جو ہمارے رسم و رواج اور ایک دوسرے کے ساتھ سماجی برتاؤ اور باہمی بھائی چارے، نفرت، محبت اور لین دین کے ہر قسم کے جذبات، احساسات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر موجزن ہیں۔ اس کے موضوعات میں محبت، نفرت، ہجر اور وصال اور بعض جگہ تصوف رمزیہ کیفیات جیسی بھی کیفیتوں کا اظہار ہے۔ ہزارہ کی ثقافتی اور تفریحی محافل میں دوہڑہ سننے اور سنانے کی روایت عہدِ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ پرواز تربیلوی کا ایک دوہڑہ دیکھیں:

چناں میریا وے توں جیندا رہویں میرے دل دا چین سرور توں ایں
کجھ چپ چپ دِسناایں گل کے وے، ماہیہ لگدا اج مغرور توں ایں
ٹوں کر نہ کر منظور پہانویں تیری مرضی ،ماہیہ منظور توں ایں
پروزؔ! توں ایں جند جان میری، میری روندی اکھیاں دا نور توں ایں

پروفیسر محمد فرید ہندکو زبان کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کا اپنا ایک منفرد رنگ اور اسلوب ہے......ان کا ایک دوبیتا دیکھیں:

حامی اتھے بہوں نے اُس دے جان بچائیں یارا
پے گئے تیرے پچھے مندے، چھپ کتھائیں یارا
پہانویں اتھاں کھوہ ای تہاوے ، لک اُتھائیں یارا
یار فریدؔ آں دل وچ رخ کہن کول اِتھائیں یارا

اجمل نذیر کا ایک دوہڑہ دیکھیں:

دل وچ جس آں آخر بسایا، پہلا ٹینھو او یار کدے
ساری دنیا پہل جلدی اے، عشق کرے جے وار کدے
پیار دے انہے دریاواں وچ، کشتی اے بچکار کدے
جندڑی اجملؔ گل مجلسی، پر پہلسی نہ اوہ یار کدے

-------- --------

باب پنجم

ہزارہ میں خوشی وغمی کی رسومات

خوشی اور غم ہمیشہ سے انسانی زندگی کا زیور رہا ہے جس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات انسان پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اسے اپنے اردگرد کا ماحول اور اپنی زندگی کے شب و روز جنت سے کم نظر نہیں آتے اور بعض اوقات وہ ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے کہ اسے یہی دُنیا جہنم نظر آتی ہے۔ ذیل میں بچے کی پیدائش سے لے کر شادی اور مرگ و ماتم کی چند اہم تقریبات اور رسوم کا جائزہ لیتے ہیں جس میں زندگی کی رنگا رنگی اور ہماہمی کے کئی تہذیبی وثقافتی رنگ نظر آتے ہیں۔

ہم اگر بچے کی پیدائش، نوجوانی، شادی، اولاد اور پھر وفات تک کے مراحل کو ایک انسان کی زندگی کے مختلف مراحل سمجھ کر دیکھیں تو اس دوران بے شمار خوشیاں اور لاتعداد غم کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ یہی خوشیاں اور غم اور ان پر انسانی ردِعمل اور اس کی باطنی کیفیات کے اظہار کے طریقے کسی معاشرت یا تہذیب کے خدوخال واضح کرتے ہیں۔

پیدائش کی رسوم

کسی بھی نئے شادی شدہ جوڑے اور ان کے والدین کے لئے پہلے بچے کی آمد کے ساتھ ہی خوشیوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے ایک آدھ ہفتہ پہلے دائی کا بندوبست کیا جاتا ہے جو زچہ کو دردِ زہ شروع ہوتے ہی زچگی کا اہتمام سنبھال

لیتی ہے۔بچہ جب پیدا ہوتا ہےتو مسلمان گھرانوں میں سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے ۔ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی ہے ۔زچہ کے لئے خاص طور پر مقوی غذا کا اہتمام کیا جاتا ہے تا کہ اس کی صحت جلد بحال ہو۔محلے میں شرینی بانٹ کر اور کچھ گھروں میں ہزارہ کی ایک روایت کے مطابق ہوائی فائرنگ کے ذریعے اس خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔پیدائش کے ساتویں روز بعد بچے کا نام رکھا جاتا ہے، سر کے بال منڈائے جاتے ہیں ۔بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی جاتی ہے اور عقیقہ کی اسلامی رسم ادا کی جاتی ہے۔بچے کے ان بالوں کو محفوظ کرلیا جاتا ہے۔اس کے پیچھے بعض توہمات کا عمل دخل ہے ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ کسی کا جادو وغیرہ زچہ و بچہ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

چاندی صدقہ کرنے کا رواج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے البتہ اس کی قیمت کے برابر صدقہ کی رقم ضرور ادا کی جاتی ہے ۔اسی طرح بہت کم لوگ ہیں جو رسمِ عقیقہ کی استطاعت یا اس سنت پرعمل کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔تا ہم یہ ایک ایسی رسم ہے جو ہر مسلمان گھرانے میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور رائج ہے۔بعض لوگ اسی موقع پر بچے کے ختنہ کی رسم بھی ادا کرتے ہیں اور چند ایک اسے نو دس سال تک کے لئے مؤخر بھی کر دیتے ہیں۔ختنہ کی رسم بھی خالص اسلامی شعائر میں سے ہے جس کا اہتمام بطورِ خاص ہوتا ہے اور عزیز و اقارب بالخصوص زچہ کے میکے اور سسرال سے قریبی رشتہ داروں کو ضرور مدعو کیا جاتا ہے ۔اس موقع پر خاص طور پر کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور گاؤں محلے میں شرینی بانٹی جاتی ہے۔شادی کی طرح یہ رسم بھی بڑی دھوم دھام سے عمل میں لائی جاتی ہے۔

شادی بیاہ کی تقریبات اور رسمیں

ہر رسم کے مذہبی اور سماجی دو پہلو ہوتے ہیں۔ مذہبی پہلو میں تو تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن سماجی پہلو میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے، شادی کی تقریب میں جس قدر شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح گھر والوں کی سماجی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے مسلمانوں میں شادی کی تقریب میں سادگی پر بہت زور دیا جا تا ہے لیکن مسلمانوں نے ہندوانہ رسم ورواج اپنا کر شادی بیاہ کے موقع پر خوب دل کھول کر خرچہ کرنا شروع کیا۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمان اور ہندو صدیوں تک ایک ساتھ رہے۔ جس کے نتیجے میں مشترکہ رواج اور ملی جلی تہذیب نے جنم لیا ،مسلمانوں میں نکاح ، پیدائش،موت، تجہیز وتکفین کی رسومات اپنے طرز پر تھیں لیکن شادی بیاہ میں جس قدر رسم ورواج نے فروغ پایا ان میں میڈیا کی مہربانی سے بعض ہندوانہ رسمیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ اگر چہ علماء کرام نے مسلمانوں کو ان رسموں کے اپنانے سے روکا لیکن شادی بیاہ کی ان رسومات نے پھر بھی کسی حد تک اپنی جگہ بنائی ہوئی ہے۔

اپنا گھر بسانے کے بعد اولاد کا گھر بسانے کی فکر انسان کی تمدنی خصوصیات میں شامل ہے۔ کسی والدین کا لڑکا جب سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو وہ گھر میں بہو لانے کی سوچنے لگتے ہیں۔ بعض حالات میں بچپن میں لڑکے لڑکی کا ناطہ طے کر دیا جا تا ہے جس کا مقصد خاندان میں جوڑ قائم رکھنا ہے۔ بچپن کی منگنی کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ جب لڑکی جوان ہو جائے تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ستاتی ہے دوسری طرف جوان لڑکے کی ماں بہنیں رشتہ دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ رشتہ خاندان برادری میں ہو تو

بہتر تصور کیا جاتا ہے۔خوبصورت لڑکی اور اس کے خاندان کی مالی حیثیت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اگر انہیں اپنے عزیز و اقارب میں کوئی لڑکی سوجھتی ہے تو اس کے ماں باپ سے خود رشتہ طے کرنے کی بات کرتے ہیں۔بعض دفعہ رشتہ کی بات براہ راست کرنے کی بجائے کسی رشتہ دار یا بااثر آدمی کے ذریعہ سے بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔ورنہ یہ کام کسی معتبر آدمی کے سپرد کیا جاتا ہے۔عام اصطلاح میں اسے ''گل ٹورنا'' کہتے ہیں۔ رشتہ ناطہ کی بات کو حد درجہ صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے۔رشتہ سے انکار کا معاملہ نازک ہوتا ہے اکثر اوقات اس بات پر ناراضگی جنم لیتی ہے جو بعض صورتوں میں دشمنی میں بدل جاتی ہے۔لڑکے کے کردار اور چال چلن کے بارے میں خفیہ تحقیق کی جاتی ہے۔

رشتہ تلاش کرنے والا (مرد یا عورت) جب اپنی جستجو میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے نقدی، کپڑوں کا جوڑا یا شرینی کی صورت میں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے جسے مٹھائی کہتے ہیں۔

رشتہ کی ''ہاں'' ہونے کی صورت میں رسم منگنی ادا کی جاتی ہے۔لڑکے والے اپنی طرف سے چند خواتین کو اس کام کے لئے مامور کرتے ہیں۔اس تقریب میں دولہا اور دلہن کے قریبی عزیز رشتہ دار اور اقرباء ہی شریک ہوتے ہیں۔سب کا منہ میٹھا کرایا جاتا ہے۔لڑکے کی طرف سے اس کی منگیتر کو سرخ یا گلابی جوڑا دیا جاتا ہے اور انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔ہندکو زبان میں منگنی کے لئے ''ناں لکھواں'' یعنی رشتہ طے ہونا کہا جاتا ہے۔اس موقع پر لڑکے کی بہنیں، بھانجیاں، بھتیجیاں چند مخصوص گیت بھی گاتی ہیں۔ رُخصتی تک لڑکے والے اس کی منگیتر کو عید، شب قدر یا اہم تہوار پر کپڑے اور تحائف وغیرہ بھیجتے رہتے ہیں۔

بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ حسب توفیق تیاری کرنا شروع کر دیتے ہیں تاہم شادی کے کچھ دن پہلے کچھ خصوصی انتظامات ہوتے ہیں۔ لڑکی کو گھر کی ضرورت کا تمام سامان (داج) ماں باپ کے ذمہ ہوتا ہے۔ لڑکی والوں کے ہاں لحاف تیار کرنے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ قرب وجوار اور رشتہ دار خواتین امداد باہمی کے اصول پر لحاف تیار کرنے کا کام کرتی ہیں۔ فرنیچر اور زیور وغیرہ کے آرڈرز دیئے جاتے ہیں اور شادی کی دیگر تیاریاں کی جاتی ہیں۔

دولہا کے گھر والے بھی مہمانوں کی خاطر تواضع کی تیاریاں مکمل کر رہے ہوتے ہیں۔ امیر گھرانوں میں درزی کو بٹھا کر لباس تیار کرائے جاتے ہیں۔ کئی گھرانوں میں لڑکی والوں کے گھر لحاف میں ڈالنے کے لئے روئی بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کی مدد ہے اور اس بات کا اقرار بھی کہ رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے۔ منگنی کے بعد لڑکی والے اپنی برادری کے چند سرکردہ افراد کے ساتھ لڑکے والوں کے گھر جاتے ہیں جہاں ان کی خاطر مدارت اور آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ اس رسم کو ''بر گیلا'' کہتے ہیں یعنی میل جول بڑھانا یا تعلق قائم کرنا۔

دولہا اور دلہن کے بزرگ اور خاندان کے لوگ باہمی رضامندی سے تمام رسومات کی تاریخ طے کر لیتے ہیں اور رسماً اعلان ایک باقاعدہ تقریب میں کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اسی روز نکاح بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس دن ہر طرف خوشی کا سماں ہوتا ہے۔ لڑکی والے دولہا کے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ گاؤں کا نائی بلند آواز میں مقررہ تاریخ کا اعلان کرتا ہے۔ دعائے خیر کے بعد فضاء میں پٹاخوں یا فائرنگ کی آواز آنے لگتی ہے۔ اس روز سے دولہا اور دلہن کے گھر شادی کی تقاریب بھرپور طریقے سے

شروع ہو جاتی ہیں۔

رخصتی سے چند دن قبل دولہا کی بہنیں اور رشتہ دار خواتین پوری سج دھج کے ساتھ ہنستی کھیلتی گاتی بجاتی لڑکی والوں کے گھر جا پہنچتی ہیں۔ان کے ساتھ ڈھولک ضرور ہوتی ہے۔ان کے ہمراہ مٹھائی، فروٹ اور دلہن کے لیے عروسی ملبوسات اور دیگر لوازمات گاؤں کا نائی اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔دلہن والوں کے صحن میں خوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر بعض مخصوص گیت بھی گائے جاتے ہیں:

بساں نال بس ٹکری بس شیشہ پہن گئی آ
خان مہارا جے آں ساری دنیا من گئی آ

ملاں بازارے آں اگے تھال کروڑے نی
میرے ویرے دے لکھ پتیے سوہرے نی

کنڈا لگ گیا تھالے نوں
اج مٹھاں لتاں مہندی لگ گئی قسمت والے نوں

چٹے چنے دی چاندری......میں ربن پر آندا پانی آں
توں کڈ موٹر میں آئی آں

شادی سے ایک دو دن قبل دولہا والے دلہن کو اور ایک آدھ دن پہلے دلہن والے دولہا کو مہندی لگانے جاتے ہیں۔رسمِ حنا تمام اسلامی ممالک میں موجود ہے۔مصر

میں اس رات کو لیلتہ الحناء کہا جاتا ہے۔دلہن سمیت تمام خواتین ہاتھوں پر خوبصورت نقش و نگار بناتی ہیں۔مہندی بڑے تھال یا پرات میں گھول کر لے جائی جاتی ہے اس کے اوپر موم بتیاں جلائی جاتی ہیں اور چاندی کے ورق سے اسے سجایا جاتا ہے۔گاؤں کی نائن مہندی پیش کر کے نیگ (شگن) وصول کرتی ہے۔مہندی کے تھال کو اٹھا کر رقص کرنا رسم مہندی کا خاصہ ہے۔

مہندی کے ساتھ ہی ایک رسم مائیوں میں بٹھانا ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کو مایوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔لڑکی کو معمولی کپڑے پہنا کر گھر کے کسی ایک کونے میں چوکی یا کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے کہ نظر بد سے بچی رہے۔لڑکی کے بدن پر خوشبودار اُبٹن مل دی جاتی ہے۔مہندی کی رات دلہن کے بالوں میں مینڈھیاں کھول کر سہاگنیں بالوں میں تیل لگاتی ہیں اور شگن کے گیت گاتی ہیں۔

"مایوں" بیٹھی دلہن کا بھائی اس کی چادر کے کونوں پر گانٹھیں لگاتا ہے جو دراصل نصیحت ہے کہ تم دوسرے گھر جا کر ہماری عزت کا خیال رکھنا اور کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے ہم پر حرف آئے۔دولہا کو مہندی لگتی ہے تو خوب ہلا گلا اور شور و غل ہوتا ہے۔محلّہ بھر کی لڑکیاں،عزیز رشتہ دار خواتین خصوصاً دولہا کی بہنیں خوب ناچتی گاتی ہیں۔فضاء میں گونجنے والے روایتی لوک گیت اور نغمے ان کے جذبات کے عکاس ہوتے ہیں:

مہندی شیندی لاندیا وے.....تداں اللہ دیاں دعائیاں
تو جی پہنڑاں دیا پیہایا وے.....تو جی بہوٹی دیا سائیاں
تیرا بنا سوایا سالیاں......
ماميان پھپھیاں والیا وے، تداں اللہ دیا دعائیاں

آ ونڑیا جمعراتی
تیری اللہ کرے حیاتی
خان مہا راجا، میری گلی دودھ وسدے
پھلاں دیاں لڑیاں دا ہار پرویا تد واسطے

چٹے چنے دی چانڑی.....پھل ٹھٹھا پڑچھیا آ لے توں
میں صدقے گنڈیاں والے توں

ٹکا جیا ریڈوا، تار ترٹ گئی باجے دی
گانا میں بہنساں، میں پتر مہاراجے دی

بعض علاقوں میں شادی سے ایک دو دن پہلے ''وری'' دکھانے کا رواج بھی ہے۔اس رسم میں دولہا کے گھر سے عورتیں زیورات پارچات اور مہندی لے کر دلہن کے گھر آتی ہیں۔ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں اور وہ دلہن کا بناؤ سنگھار کر کے ایک خوبصورت کرسی پر بٹھاتی ہیں۔باری باری سب اسے پیسے اور دُعا دیتی ہیں۔اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کے لئے بھی تحفے وغیرہ بھیجے جاتے ہے،جن میں کپڑے،انگھوٹی،خوشبو اور گھڑی وغیرہ ہوتی ہے۔

نوجوان لڑکیاں جس میں دولہے کی بہنیں، بھابیاں، خالہ زاد، ماموں زاد اور چچا زاد بہنیں اپنی ہم عمر سہلیوں اور مہمان لڑکیوں کے ساتھ مل کر قریبی پنگھٹ پر جاتی ہیں جہاں سے پانی کا گھڑا یا گاگر بھر کر لاتی ہیں......راستے بھر گیت گاتی آپس میں

چھلیں کرتی جاتی ہیں ۔اس رسم کو" گھڑولی بھرنا" کہتے ہیں ۔اس موقع کے لئے کچھ لوک گیت مخصوص ہیں جو صدیوں کے تہذیبی وثقافتی رسم ورواج کے عکاس ہیں ۔

گھڑولی جب گھر میں پہنچتی ہے تو کھارے کی رسم ادا ہوتی ہے۔کھارا اس ٹوکرے کو کہتے ہیں جس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دولہا نہاتا ہے۔ یہ ٹوکرا الٹا کر رکھ دیا جاتا ہے اور دولہا اس پر بیٹھ جاتا ہے۔مردوخواتین دولہا کے سر پر دوپٹے کا سایہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔جہاں دولہا گھڑولی کے پانی سے غسل کرتا ہے اور اس موقع پر بھی خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں ۔دوسری طرف دُلہن کو خواتین نہلاتی ہیں اور وہاں بھی کھارے کے گیت گائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر دولہا دُلہن کے ماموں اور مامیوں کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے دونوں کو کھارے سے اُتارنا ہوتا ہے اور نیگ، شگن وغیرہ ادا کرنے ہوتے ہیں۔دولہے کو کھارے سے اترتے وقت کیچڑ میں پڑی ہوئی ٹھیکریوں یا ثابت ہانڈیوں پر پاؤں رکھ کر اور پاؤں کا دباؤ بڑھا کر انہیں توڑ کر گزرنا ہوتا ہے۔ دولہے کو بہنوں کی طرف سے لایا گیا سہرا پہنایا جاتا ہے اور عزیز رشتہ داروں کی طرف سے لائے گئے پھولوں اور نوٹوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں ۔ دوسری طرف دُلہن کو نئے کپڑے اور زیور وغیرہ پہنا کر تیار کیا جاتا ہے۔اس موقع پر بھی دولہے کی پھوپھیاں، خالائیں، حقیقی اور رشتے کی بہنیں سہرے کے گیت گاتی ہیں جنہیں دولہا کے بھائیوں اور ماموؤں کی طرف سے پیسے وغیرہ بطور نیگ یا شگن دیئے جاتے ہیں ۔ سہرے کا روایتی لوک گیت دیکھیں:

کپڑے شپڑے لاندیا وے، تداں اللہ دیاں دعائیاں

تو جی پہنڑاں دیا پہایا، توں جی بھوئی دیا سائیاں
تیرا بنا سوایا سالیاں
ماسیاں پھپھیاں والیا وے، تداں اللہ دیا دعائیاں

کھولاں گت ماہیا پچھے لال پرآندا ای
خوشی نال لا ویرا پہنڑوں جوڑا آندا ای

کیوں ہوئیں دلگیر
تیرے آسے پاسے ویر

بس تلاں داروں شیشہ پہن گئی آ
خان مہاراجے آں ساری دنیا من گئی آ

دو لہے کے ساتھ سربالہ (چھوٹا دولہا) جو عموماً دو لہے کا نابالغ بھائی، بھتیجا، بھانجا وغیرہ ہوتا ہے۔ یہ دو لہے کے ساتھ ساتھ اگلے تمام مرحلوں میں بارات میں نمایاں رہتا ہے۔ دو لہے کو باراتیوں کے درمیان بٹھا کر سلامیاں وغیرہ دی جاتی ہیں اور یہیں پر عزیز رشتہ داروں کی طرف سے نیوندر (بھاجی) وغیرہ بھی لوٹائی جاتی ہے

جب سلامیاں وغیرہ مل جاتی ہیں تو دولہا کو سجی سجائی گھوڑی یا گھوڑے پر بٹھایا جاتا ہے۔ جس کی باگ عموماً دولہا کی بہنیں اور بھابیاں تھام کر رکھتی ہیں اور اس موقع پر بھی وہ گیت گاتی ہیں اور اپنے بھائی سے شگن وصول کرتی ہیں ......اس موقع پر ڈھول

شہنائی کا اہتمام ہوتا ہے......آج کل گھوڑی پر بیٹھنے کی رسم مٹتی جارہی ہے جس کی جگہ بجی سجائی موٹر کار نے لے لی ہے......اب بارات تیار ہو دلہن کے گھر کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔باراتی ساتھ ہوتے ہیں،۔ڈھول شہنائی یا بینڈ باجے کے ساتھ جب بارات روانہ ہوتی ہے تو دولہے کا باپ یا بھائی چھوٹی کرنسی کی مٹھیاں بھر بھر کر دولہے کے سر سے وار کر پھینکتا جاتا ہے۔آج کل یہ رسم بھی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔البتہ بہت سے دیہی علاقوں میں اب بھی اس کا مظاہرہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

بارات جب دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو یہاں بھی ایک رسم ہوتی ہیں جو آج بھی کسی نہ کسی روپ میں کچھ دیہاتوں اور پرانی کتابوں میں گیتوں کی شکل میں زندہ ہے۔اسے ٹھدیاں (طعنے) کہتے ہیں جو دراصل طنز ومزاح کا ایک روپ ہے۔

پہاڑی علاقوں میں بارات کے قریب آنے پر ایک بھاری پتھر راستہ میں رکھ دیا جاتا ہے جسے باراتیوں میں سے کوئی شہ زور اٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے اسے ''دبئی اٹھانا'' کہتے ہیں۔سب واہ واہ کہ اٹھتے ہیں اور بارات آگے بڑھتی ہے۔بعض جگہوں پر درخت کے ساتھ کوئی شے باندھ کر اسے نشانے سے گرایا جاتا ہے جسے ''دشمن مارنا'' کہتے ہیں۔

بارات کو انتہائی عزت اور تکریم کے ساتھ بٹھایا جاتا ہے جہاں دولہا کو شادی کی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے اور نکاح کی رسم ادا کی جاتی ہے۔نکاح ایک خالص اسلامی اور شرعی معاہدے کا نام ہے جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان اپنے اپنے ولیوں کے سامنے ایجاب و قبول کا اعلانِ شرعی ہوتا ہے۔قرآن و حدیث میں نکاح کی سماجی اور دینی فضیلتوں کا بیان بڑے خوبصورت انداز میں ملتا ہے جو نسلِ انسانی کی ترقی

اور بقا اور تمدنی زندگی کے ارتقاء کی پہلی سیڑھی تصور ہوتا ہے۔قرآنِ پاک نے سورۃ الروم مین خاوند کے لئے بیوی اور بیوی کے لئے خاوند کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے بتایا ہے۔نکاح کا مسنون طریقہ سے پڑھایا جاتا ہے۔نکاح کے خطبۂ مسنونہ کا سننا واجب ہے۔دو نامزد گواہوں کی موجودگی میں لڑکے سے ایجاب وقبول کرایا جاتا ہےاس موقع پرلڑکی اورلڑکے کےوالد کا نام لیا جاتا ہےاورمہر شرعی کاتعین کے دعا کی جاتی ہے...... دعا کے بعد چھوہارے یا کوئی بھی میٹھی چیز تقسیم کی جاتی ہیں ۔یوں نکاح کی رسم ادا ہو جاتی ہے۔

نکاح کے بعد بارات کوکھانے کی دعوت دی جاتی ہے ۔اس موقع پر عموماً عورتیں کچھ گیت گاتی ہیں۔بعض علاقوں میں بارات کوراستے میں روکا بھی جاتا ہےاور کچھ رقم بطور رنیگ وصول کر کے کھانے کی اجازت لیتے ہیں ۔دوسری طرف دولہے کو چند لمحے ستانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے ۔دولہے کوجہیز کے درمیان لاکر بٹھایا جاتا ہے جہاں دلہن کی بہنیں اور بھابیاں دولہے کے خوب لتے لیتی ہیں ۔بارات جب کھانے سے فارغ ہوکر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹتی ہےتو دوبارہ ڈھول شہنایوں کی گونج میں دولہااور باراتی واپسی کی راہ لیتے ہیں۔

لڑکی کوقرآن کے سائے میں دعاؤں کے ساتھ ڈولی میں بٹھایا جاتا ہے۔دلہن کے بھائی کندھوں پر رکھ کر ڈولی گھر کی دہلیز تک لاتے ہیں۔ڈولی گھر سے نکلتی ہےتو لڑکےوالے ڈولی پر سکّے نچھاور کرتے ہیں،جسے بچے لوٹ لیتے ہیں۔ڈولی اتروائی کی رسم میں کچھ رقم یا قیمتی شے لے کر دلہن کودے دی جاتی ہے۔ڈولی گھر میں داخل ہوتو بکرا بطورِ صدقہ ذبح کر دیا جاتا ہے۔ڈولی چھوڑ کر واپس جانے والے اس گاؤں سے پانی

تک بھی نہیں پیتے۔

دوسری طرف دولہا کے گھر میں چہل پہل کا سماں شروع ہو جاتا ہے جہاں دولہے کی ماں، بہنیں، خالائیں اور چچی تائی وغیرہ ان کا استقبال کرتی ہیں۔دولہا دلہن گھر کی چوکھٹ پر آ کر رک جاتے ہیں جہاں سرسوں کا تیل چوکھٹ میں بہایا جاتا ہے اور دلہن کو قرآن پاک کے سائے میں گھر میں داخل کیا جاتا ہے۔

دلہن کو ڈولی سے اتر کر زمین پر پاؤں نہیں رکھنے دیا جاتا بلکہ پاؤں کے نیچے روئی کے گالے رکھے جاتے ہیں۔دلہن کی جھولی میں بچہ ڈالا جاتا ہے کہ اس کی گود بھی ہری رہے۔جو عورتیں دلہن کو دیکھنے آتی ہیں وہ اسے کچھ نقد رقم بطور سلامی بھی دیتی ہیں اور دلہن انہیں مٹھائی پیش کرتی ہے۔دلہن کا گھر نزدیک ہو تو تین دن تک کھانا گھر سے آتا ہے۔

شادی کے تیسرے دن دولہا قریبی دوستوں سمیت سسرال سلامی کے واسطے جاتا ہے۔پر تکلف کھانے پر سالیاں اور سہیلیاں خوب ہنسی مذاق کرتی ہیں۔اسی دن لڑکی کی بہنیں اور سہیلیاں دولہا کے گھر آتی ہیں وہاں ان کو کھانا پیش کیا جاتا ہے۔دلہن انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ساتویں روز دلہن کو ماں باپ کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔کچھ روز میکے میں رہنے کے بعد دلہن جب واپس سسرال لوٹتی ہے تو مخصوص قسم کے پکوان بطور سوغات اپنے ساتھ لے کر آتی ہے جسے گاؤں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ دلہن واپس آ گئی ہے۔دلہن کی اداسی دور کرنے کے لئے اسے مہینے میں ایک دو بار میکے بھیجا جاتا ہے۔جب بہو کا جی سسرال میں اچھی طرح لگ جائے تو یہ وقفے طویل تر ہو جاتے ہیں۔

مرگ و ماتم کی رسمیں

حیاتِ انسانی کے ساتھ خوشی اور غم جڑے ہوئے ہیں۔ ایک کہاوت ہے..... جو گھڑیا سو بھجنا (یعنی جو بنا ہے اس نے بالآخر ٹوٹ جانا ہے)، ہر انسان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ انسانی زندگی میں سب سے بڑا غم اور سب سے بڑا دُکھ کسی پیارے کی موت کا دُکھ اور غم ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی جدائی کا دُکھ پتھر دل انسان کو بھی رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسلام میں بلاشبہ کسی کی موت پر صبر اور استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور کسی بھی موت کا سن کر ہم سب سے پہلے انا للہ و انا الیہ راجعون (بے شک ہم اللہ کی طرف سے ہی آئے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ جانا ہے) ہی پڑھتے ہیں لیکن آنکھیں پھر بھی ڈبڈبا جاتیں ہیں۔ خواتین کا دل چونکہ مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے اسی لئے مرگ و ماتم کے موقع پر ان کے بین اور رونا پیٹنا ایک عجیب غم انگیز منظر پیدا کر دیتا ہے۔

مسلمان ہر وقت دُعا کرتے ہیں کہ مرتے وقت کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ نصیب ہو۔ جسے یہ نصیب ہو جائے اس کا انجام اچھا تصور کیا جاتا ہے۔ ہزارہ میں اگر کسی مسلمان کی موت واقع ہو جائے تو سب سے پہلے میت کو غسل دیا جاتا ہے اور کفن پہنایا جاتا ہے۔ چارپائی پر میت رکھ کر چاروں کونوں سے کندھوں پر اُٹھایا جاتا ہے اور قبرستان میں لے جایا جاتا ہے۔ میت کو کندھا دینا باعثِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ قبرستان کے نزدیک کھلے میدان یا جنازہ گاہ میں اجتماعی نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے (جنازے میں خواتین شامل نہیں ہوتیں)۔ قبریں شمالاً جنوباً کھودی جاتی ہیں اور ان میں میت کو دفنایا جاتا ہے۔

زیادہ تر لوگ دوسرے، تیسرے دن قل خوانی، ساتویں دن جمعرات اور چالیسویں دن چالیسواں کرتے ہیں جس میں مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی کا خاص طور پر اہتمام ہوتا ہے اور مرنے والے کی مغفرت کے لئے اجتماعی دُعا کی جاتی ہے۔

عام رواج یہ ہے کہ قل خوانی تک میت کے گھر والوں کے ہاں چولہا نہیں جلتا اور ان کے قریبی عزیز رشتہ دار یا ہمسائے مہمانوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ ہزارہ میں اپنے پیاروں کی موت پر عموماً تین، سات یا چالیس روز تک سوگ منایا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں خواتین اکٹھی ہو کر مرنے والے کی یاد میں وین (سیاپا) الاپتی ہیں جس میں دُنیا کی بے ثباتی، موت کے اٹل حکم اور مرنے والے کی صفات اور خوبیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض چار بیتے بھی مشہور ہیں جو یہاں کی لوک روایت اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ اگر تہذیبی طور پر دیکھا جائے تو یہ چیزیں مرثیے میں بھی موجود ہیں لیکن مرثیہ بحر، ردیف اور قافیے کے علاوہ ایک الگ تاریخی اور ثقافتی پس منظر رکھتا ہے جبکہ یہ چار بیتے برجستہ نکلے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ خواتین ایک دوسری کے گلے لگ کر بھی انہیں پڑھتی ہیں۔ تاہم زیادہ تر پڑھے لکھے گھرانوں اور برادریوں میں ان کے بجائے قرآن خوانی، سورہ یٰسین کی تلاوت اور مرنے والے کے لئے قرآنی دُعاؤں کو پڑھا جاتا ہے جس کے پیچھے اسلامی تعلیمات کا وہ تہذیبی اور ثقافتی پس منظر نمایاں ہوتا ہے جو یہاں کے مسلمانوں کی صدیوں سے روایت ہے۔ ان پڑھ یا نیم خواندہ طبقوں کی خواتین روایتی سینہ کوبی بھی کرتی ہیں جسے عموماً

ناپسند کیا جاتا ہے۔

مرنے والے کے عزیز و اقارب سے اظہار یکجہتی اور دکھ درد میں شرکت کے لئے تعزیت کی جاتی ہے۔خواتین گھروں کے اندر اور مرد حضرات حجروں میں بیٹھ کر مرنے والے کے والدین، بھائیوں، بیٹوں اور قریبی عزیزوں سے اظہار افسوس کرتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔

باب ششم

ہزارہ کے لوک رقص

انسان کی وجدانی کیفیات کے مظہر لوک ناچ بھی رس کا اہم حصہ ہیں۔ان میں جذبات کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں وہ باتیں کی جاتی ہیں جس کا باطنی وجود تو ہوتا ہے لیکن ظاہری علم کسی کو نہیں ہوتا۔رقص کے انداز میں خوشی اور محبت کے اسرار و رموز کی اظہار انسانی فطرت کی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ناچ کی ابتدا کا تعلق اسی دور سے ہے جب انسان غاروں میں رہتے اور جانوروں کے شکار پر گذر بسر کرتے تھے۔اس زمانے میں حصولِ شکار کی خوشی میں یا اظہار محبت کے طور پر رواج میں لایا گیا۔رفتہ رفتہ اسے دشمن پر فتح پانے اور شادی بیاہ کے موقع پر بطور جشن ترقی دی گئی۔اس وقت یہ مختلف ممالک کی ثقافتوں کا جزو لازم ہے۔

کہر

شادی بیاہ کے موقع پر کیا جانے والا یہ لوک رقص جسے مرد اور خواتین مشترکہ یا علیحدہ صورت میں پیش کرتے ہیں۔اس میں عورتیں سہرے گاتی ہیں اور مرد گیت الاپتے ہیں۔یہ ناچ ڈھول اور شہنائی پر ہوتا ہے۔اس میں کسی خاص انداز میں ناچنے کی پابندی نہیں ہوتی۔بعض اوقات یہ سنجیدہ حالت سے بدل کر مزاحیہ صورت بھی اختیار کر جاتا ہے جو اس کی پر لطف خصوصیت ہے۔

گتکہ

ہزارہ کا یہ ایک مقبول کھیل ہے جو شادی بیاہ، تفریحی تقریبات اورعوامی اجتماعات میں یکساں مقبول ہے۔اس میں دو نوجوان ایک مخصوص قسم کی چھڑی یا تلوار ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں اور اپنی عملی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس میں مدِ مقابل پر وار کرنے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے انتہائی مہارت، پھرتی ،تیزی اور چستی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔قدیم دور میں بھالوں، برچھیوں اور تلواروں سے لڑنے کی تربیت اسی انداز میں دی جاتی تھی......اب یہ جنگ وجدل کے بجائے تفریح کا ایک مشغلہ بن چکا ہے اور ہزارہ میں بہت مقبول ہے۔

ڈنڈے کھیلنا

اسے ڈانڈیا بھی کہتے ہیں ۔یہ اس طرح ہوتا ہے کہ دس بارہ آدمی لکڑی کی گھنگھرو بندھی چھوٹی چھوٹی (تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبی) چھڑیاں ہاتھوں میں لے کر انہیں ڈھول شہنائی کی دھن پر ایک دوسرے سے ٹکرا کر ناچتے ہیں اور حلقے کی صورت میں چکر لگاتے رہتے ہیں ۔چھڑیوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز جب ڈھول کی تال پر مچلتی ہے تو سارا ماحول مستی میں آجاتا ہے۔اس میں گائے جانے والے بول بے ربط مگر دل میں چبھنے والے ہوتے ہیں۔

لڈی

یہ ہزارہ کا مشہور لوک رقص ہے......اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ڈھول شہنائی کی مخصوص دھن اور آہنگ میں رقص وموسیقی کے ملے جلے شور سے برق وباراں کا سماں بندھ جاتا ہے اور دیکھنے سننے والے مست ہو کر اس شور میں شریک ہو جاتے ہیں۔اس

رقص میں بہت سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں ڈھول اور شہنائی بجانے والوں کے گرد تالیاں بجاتے، اچھلتے کودتے اور ناچتے جاتے ہیں۔ کبھی دائرے کی شکل میں اور کبھی انفرادی یا دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ایک دوسرے کے بالمقابل ہر آ مختلف قسم کے کرتب دکھاتے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ڈھول کی آواز بڑھتی اور تال بدلتی ہے تالیوں کا شور بھی بدلتا اور بڑھتا جاتا ہے۔ رقص کرنے والوں سے زیادہ رقص دیکھنے والوں کا شور و غل اور ہلہ شیری اسے مزید پر لطف بنا دیتا ہے۔

باب ہفتم

ہزارہ میں لوک داستانوں کی روایت

پروفیسر کلیم الدین احمد داستان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "داستان کہانی کی طویل، پیچیدہ اور بھاری بھر کم صورت ہے لیکن اپنی طوالت، پیچیدگی، بوجھل پن کے باوجود کہانی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ یہ بھی دل بہلانے کی ایک صورت ہے۔ داستان کوئی ایک دلچسپ مشغلہ ہونے کے ساتھ ساتھ فنی تخصیص بھی رکھتی ہے اور ہر کس وناکس داستان گو نہیں ہو سکتا۔"

داستان کا لفظ بڑا ہمہ گیر ہے اور ادبی داستانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قصے کے تمام اقسام شامل ہیں۔۔۔۔ انگریزی میں ایک لفظ Tale (جو اردو اور فارسی میں قصہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے) استعمال ہوتا ہے۔ Tale میں بالعموم فرضی اور خیالی واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ ایسی کہانیوں کا مقصد دل بہلاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں کسی اصلاحی تحریک یا فلسفیانہ اندازِ فکر کی تلاش بے سود ہوگی۔ یہ الگ بات ہوگی کہ غیر شعوری طور پر ان قصوں کے ضمن میں کوئی اصلاحی مقصد بھی حاصل ہو جائے ...... انگریزی میں دوسری قسم Parable ہے۔ اس قسم کی کہانیوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ظاہری صورتوں کا معنی سے حقیقی تعلق نہیں ہوتا بلکہ سیدھے سادے لفظوں کی تہ میں گہرے اور فلسفیانہ معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیاں کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ فارسی زبان میں مثنوی معنوی کی

بعض حکایات اور بوستانِ سعدی کے کچھ منظوم قصے اور اردو میں وصال العاشقین (سب رَس) اسی نوع کی منظوم داستانیں ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے قصہ گل بکاؤلی کے باطن میں بھی بعض عارفانہ حقائق و متصوفیانہ نکات کو پوشیدہ بتایا ہے۔

کہانی یا داستان کی تیسری قسم وہ ہے جسے انگریزی میں Fable کہتے ہیں اور معنوی اعتبار سے اسے Tale اور تمثیل کا مرکب خیال کرنا چاہیے۔ اس میں بالعموم پرندوں اور جانوروں کے وسیلے سے کوئی داستان بیان کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ان کہانیوں میں فرضی انسانی کردار بھی کام کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر ذی روح کو ذی روح بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں میں بھی کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ حکایاتِ لقمان کا شمار ایسے ہی قصوں میں ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں منطق الطیر اور اردو میں طوطی نامہ اور پنچھی نامہ اس قسم کے قصوں کی واضح مثالیں ہیں۔

چوتھی قسم کی وہ کہانیاں ہیں جنھیں انگریزی میں رومانس (Romance) کہا جاتا ہے، اردو میں رومانس کا متبادل لفظ رومان بطور اصطلاح مروج ہو چکا ہے۔ اس کے حدود میں عشق و محبت کے واقعات کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے حادثات اور مہمیں داخل ہو جاتی ہیں۔ رومان میں المیہ وطربیہ دونوں قسم کے واقعات ہوتے ہین لیکن یہ عناصر ایک دوسرے میں اس طرح سے خلط ملط ہوتے ہیں کہ ان پر المیہ وطربیہ کا حکم لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی مثال داستان سیف الملوک، قصہ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا وغیرہ سے دی جا سکتی ہے۔ ایسی داستانوں میں بعض مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت اور ان کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ داستانوں میں اس عنصر کا دخل ضروری نہ سہی پھر بھی دُنیا کے مختلف ادبی شہ پاروں میں بہت کم ایسی کہانیاں یا داستانیں ملیں گی جو مافوق

الفطرت عناصر سے خالی ہوں۔

یہ ساری بحث تو پڑھی لکھی کہانیوں اور داستانوں کی ہے لیکن بعض کہانیاں نت نئے تجربات اور ہنگامی حوادث کے بطن سے بھی جنم لیتی ہیں۔ ان میں سے بے شمار صفحہ قرطاس پر منتقل بھی نہیں ہو پاتیں لیکن ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک خاندان سے دوسرے خاندان، ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں سینہ بسینہ سفر کرتی ہوئی ایک مخصوص حوالے سے کسی مخصوص خطے کی تہذیبی و ثقافتی شناخت کا حوالہ بن جاتی ہیں...... انہی کہانیوں کو لوک داستان کا نام دیا جاتا ہے۔

اس بات کا تعین تو آج تک نہیں ہو سکا کہ روئے زمین پر سب سے پہلی داستان کس نے اور کس کو سنائی گئی مگر یہ ماننے میں تامل نہیں کہ قصہ کہنا یا سننا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس لئے کہ اس کا رشتہ انسانی زندگی سے بہت قدیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قصے کی ابتدا شاید وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے یعنی جب انسان اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل پر قادر ہوا ہوگا اور اس اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کرنے شروع کیے ہوں گے تب ہی قصے کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ زمانہ قدیم میں جب انسان جنگلوں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں رہتا تھا اس وقت نہ تو اس کے پاس تہذیب کی دولت تھی اور نہ اپنی بات پہنچانے کی کوئی صورت جو اس کا تعلق دُنیا کے دُور دراز علاقے میں رہنے والوں سے قائم کر سکے۔ اس لئے اس زمانے میں انسان بہت ہی محدود انداز کی زندگی گزارتا تھا اور عورتیں گھر کا کام کیا کرتی تھیں اور مرد دن بھر روٹی روزی کمانے کی فکر میں جنگل اور ویرانے میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ظاہر ہے جب مرد اپنے سفر سے شام تک واپس آتا تھا تو

کبھی وہ دشمنوں سے مقابلے کا قصہ سناتا تھا اور کبھی شکار مارنے میں اپنی بہادری اور جواں مردی کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔ پرانے زمانے کے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ آرام اور ذہنی تفریح کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں تھا۔ عورتیں اپنے مردوں سے سنے ہوئے قصے اپنی ساتھی خواتین کو سناتی تھیں اور اس طرح قصے کہانیوں کا سلسلہ ایک آدمی سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے آدمی تک پہنچتا رہتا تھا اور بہت سی کہانیاں اتنی مشہور ہو جاتی تھیں کہ ان کو لوک کہانی اور کبھی کبھی ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔

اپنی ذات سے نکل کر انسان جیسے جیسے کائنات اور اس کی وسعتوں سے آشنا ہوا اس کی کہانیوں میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی ۔صحرا نوردی اور خانہ بدوشی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات ، کائنات کی وسعتیں اور نیرنگیاں ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے قصے میں نہ صرف طوالت کو داخل کیا بلکہ حیرت واستعجاب ، رومان اور تخیّل کو بھی قصے کا حصہ بنایا۔ دھیرے دھیرے ان قصوں میں نہ صرف مافوق الفطرت عناصر نے جگہ پائی بلکہ مبالغہ آرائی اور تخیلی فضا بھی اس کا جزو بن گئی ۔مافوق الفطرت عناصر کا تعلق انسان کی اس فطرت سے ہے جو اس کو حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین باتوں کو توجہ سے سننے پر مجبور کرتی ہے۔ کہانیوں میں ایسے عناصر کی شمولیت کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً اس زمانے میں قصہ سنانے کا مقصد محض اپنے خیالات کا اظہار نہ تھا بلکہ اپنی ذات کی تسکین اور دوسروں پر اپنی فوقیت اور برتری کا سکہ جمانا بھی تھا۔

مظاہرِ فطرت سے برسرِ پیکار ہونے اور ان پر فتح پانے کے بعد جب انسان اپنے پرانے ساتھیوں کو یہ روداد سناتا تھا تو اپنے احساسِ برتری کی تسکین کا خواہاں ہوتا تھا

چنانچہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس نے قصوں میں نہ صرف مافوق الفطرت عناصت کو جگہ دی بلکہ مبالغہ آرائی اور تخیلی فضا بھی پیدا کی۔ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں انسان زندگی کے بہت سے معاملات میں خود کو بہت مجبور، بے کس اور کمزور محسوس کرتا تھا وہ کبھی شیر سے شکست کھا کر زخمی ہو جاتا ،کبھی آندھی اور طوفان کا مقابلہ نہ کر سکتا اور کبھی کبھی بھوت پریت کے وہمی واقعات سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ایسی باتیں انہیں حیرت انگیز واقعات پر یقین کرنے اور مافوق الفطرت عناصر کا ذکر کرنے پر مجبور کرتی تھیں ۔کبھی کبھی نا قابلِ یقین باتوں کو یقینی بنانے کے لئے بھی کسی جن، دیو یا آسمانی مخلوق کے کردار کا سہارا لیا جاتا تھا۔کچھ لوگوں نے ایک سبب اور بیان کیا ہے کہ پرانے قصے دراصل اس زمانے کے لوگوں کے خواب ہیں۔وہ لوگ ایسے خواب دیکھتے تھے جن میں نئی نئی دریافتوں اور عجیب وغریب مہمات سر کرنے کا ذکر ہوا کرتا تھا۔انسان کے بہت سے خواب اس کی نامکمل خواہشات کی تلافی کرتے ہیں۔غیر ترقی یافتہ زمانے میں جب لوگ سمندر کا سفر نہیں کر پاتے تھے تو خواب میں جل پری وغیرہ کے کردار کے ذریعے ایسے سفر کو طے کر لیتے تھے۔جب دشمنوں سے ہار جاتے تو کسی دیوزاد یا غیر معمولی قوت والے عنصر کے ذریعے اپنی جیت کا یقین کر لیا کرتے تھے۔

اگر ہم پرانے زمانے کے فارغ البال اور کم مصروف انسانوں کی زندگی کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی کہ پرانے زمانے میں انسان اکثر وقت گزاری کے لئے بھی قصے بیان کرتا تھا۔سارے دن کا تھکا ہارا انسان جب رات میں اپنے دوستوں یا بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھتا تھا یا سردیوں میں آگ کے الاؤ کے چاروں طرف گھنٹوں بیٹھ کر ٹھنڈک کے احساس کو کم کرنا چاہتا تھا تو اس وقت اس قسم کے واقعات

کےعلاوہ کوئی اور چیز اس کے دل کو بہلانے والی نہیں ہوا کرتی تھی۔ایسے ہی واقعات اور قصوں سے وہ دل بہلایا کرتا تھا اور زندگی کی مشکلات کے احساس کو بھی کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

پرانے قصوں کی اہمیت کے لئے یہی باتیں کافی نہیں، پرانے قصے پرانی تہذیب،ثقافت اور رسم و رواج کا ذخیرہ بھی ہیں۔انسانی سماج،معاشرہ،اس کے اخلاق، روایات،مذہبی اقدار،تہذیب و تمدن اور ادب غرض ہر اُس چیز سے قصے کا رشتہ قائم ہے جس سے انسان کا رشتہ ہے۔ہر قوم اور ملک کے افراد کی قدیم کہانیاں ان کے تمدن کی آئینہ دار،تہذیب کی عکاس اور ان قومی و مذہبی روایات اور اخلاق اقدار کی امین ہوتی ہیں۔چنانچہ قوموں کے تمدن کے اتار چڑھاؤ،علم و ادب کی ترقی،اُسلوب اور زبان کی کیفیت ان کے قدیم قصوں اور لوک کہانیوں میں پوری طرح جلوہ فگن نظر آتی ہیں۔اس طرح قصہ جو بعد میں داستان جیسے وسیع اور ہمہ گیر لفظ میں بدل گیا باقاعدہ فنی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

ہزارہ میں داستان گوئی یا لوک داستان سنانے کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔لوگ اب بھی گھروں اور چوپالوں اور حجروں میں مل بیٹھ کر لوک داستانیں سناتے ہیں۔اس سلسلے میں چند معروف لوک داستانوں کےعلاوہ بعض مختصر لوک کہانیاں چاربیتہ کی صورت میں بھی ملتی ہیں جو صدیوں سے سنی سنائی جارہی ہیں اور بڑی بوڑھیوں کو آج بھی ازبر ہیں۔اگرچہ یہ کہانیاں چھوٹی چھوٹی اور زیادہ تر بچوں کے لئے ہیں لیکن ان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ہندکو زبان میں داستان سننے اور سنانے کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جو کسی اور خطہ میں۔اگر ہندکو ادب کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے

کہ اس کے ابتدائی ادب کی بنیاد ہی ان کہانیوں پر مشتمل ہے جو ہمیں بعض تاریخی، کچھ نیم تاریخی اور کچھ محض تصوراتی ، کچھ مذہبی ،رومانی اور رزمیہ چار بیتوں کی شکل میں ملتی ہیں ۔زیادہ تر چار بیتوں میں تاریخی واقعات یا مذہبی شخصیات کے بارے میں ہی طبع آزمائی نظر آتی ہے۔

ہزارہ میں مقبول لوک داستانوں کی تلاش ،تدوین اوران کی از سرِ نو ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں ہزارہ کے چند محققین اور ادیبوں نے قابلِ قدر کوششیں کی ہیں جن میں پروفیسر بشیر احمد سوز کی ''ہزارہ کی لوک کہانیاں (اردو) اور یک ایہا راجہ یک ایہی رانی (ہندکو کہانیاں)''، احمد حسین مجاہد کی ''سیف الملوک''،اور قاضی ناصر بخت یار خان کی ''ہزارے دیاں لوک کہانڑیاں (زیرِ طبع)'' بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہ کوششیں محض آٹے میں نمک کے برابر ہیں کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہزارہ جیسے علمی، ادبی ،تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے قدیم اور زرخیز علاقے میں لوک داستانیں اتنی کم ہوں کہ ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکیں ۔ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی سر پھرا اُٹھے اور ہزارہ کے شہر شہر گاؤں گاؤں بکھری ہوئی ہزاروں لوک داستانوں اور بالخصوص سینہ بہ سینہ سفر کرنے والے چار بیتوں کی شکل میں تاریخی ،مذہبی اور رومانی داستانوں کا بکھرا ہوا وہ خزانہ اکٹھا کر لے جو آئندہ چند صدیوں تک آنے والی نسلوں کی رہنمائی اور اخلاقی تربیت کی بنیاد بن سکے۔

باب ہشتم

ہزارہ کی بعض کھیلیں

یہ ایک فطری اور قدرتی امر ہے کہ جب بھی کوئی بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو اسے اپنے ہاتھ پاؤں کو خود ہی حرکت دینا پڑتی ہے۔ یوں اس کے ہاتھ پاؤں چلانے سے اس کے اعضا میں طاقت آتی ہے۔ ہاتھ پاؤں چلانے میں ماں اسے سہارا اور مدد فراہم کرتی ہے۔ بچہ ماں کے سینے پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے...... پھر وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے چلنا پھرنا سیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی مدد لے کر کھڑا ہونے اور چلنے پھرنے کی کوشش کرتا جاتا ہے...... وہ کبھی چارپائی کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا ہے اور آگے چلنا چاہتا ہے اور کبھی کسی دیوار کے سہارے...... اور پھر جب وہ بغیر کسی سہارے کے کھڑا ہو کر چلنا شروع کرتا ہے تو ماں باپ اسے کھلنے کے لئے ایسے کھلونے لے کر دیتے ہیں جن سے اس کی ذہنی اور جسمانی ورزش بھی ہوتی رہتی ہے......

جب بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ از خود گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل سکے تو اس کے کھلونے اور کھیلنے کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں...... کبھی وہ کسی چھوٹی سی دیوار پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر گھڑ سواری کرتا ہوا نظر آتا ہے تو کبھی کسی برتن کے ساتھ دھاگہ باندھ کر اسے گاڑی کی طرح گھسیٹ رہا ہوتا ہے۔ یوں وہ اپنے اردگرد نظر آنے والی چیزوں کی نقل کر رہا ہوتا ہے اور یوں وہ ایک طرح سے کام بھی کرتا ہے اور کھیل بھی رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں، گلی محلے کے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل کر کبھی مٹی کے کھلونے بناتا ہے تو کبھی ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو دوبارہ جوڑ کر کوئی نئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے۔

بچے کے لئے سب سے من پسند کام کھیلیں اور مختلف کھلونوں سے اپنا جی پرچانا ہوتا ہے۔وہ پوراپورا دن گلیوں میں پھر کر نئے نئے دوستوں سے نئی نئی کھیلیں سیکھتا ہے۔اور جب چند بچے اکھٹے ہو جاتے ہیں تو وہ دوسرے بچوں کو بلانے کے لئے آوازیں دیناشروع کرتے ہیں......جوعموماًان بچوں کے لئے ہوتی ہیں جو کسی وجہ سے بروقت ان کے کھیل میں شریک نہیں ہوسکتے......مثلاً

ٹھیکری تے ٹھیکری، ٹھیکری تے ڈول

سارے بچے کھیڈدے، پیوماں دے کول

ہزارہ میں مختلف قسم کے کھیل مروج ہیں اور یہاں کے بچے بھی مختلف کھیلیں کھیلتے ہیں جوایک صحت مند تفریح اور راحت کا سامان بنتے ہیں۔ بچوں، نوعمر لڑکیوں، نوجوانوں اور خواتین کی کھیلیں مختلف النوع ہوتی ہیں جو اسی مخصوص حلقے کے لئے ہوتی ہیں۔مثلاً ''اونچلے'' نامی کھیل نوعمر لڑکوں کے لئے مخصوص ہے اور وہی یہ کھیل کھلتے ہیں۔گڑیوں کا کھیل نوعمر لڑکیاں کی کھیلتی ہیں۔نیزہ بازی کا کھیل نوجوان مردوں کے لئے ہوتا ہے۔کرکٹ نوعمر بچے بھی کھیلتے ہیں لیکن یہ نوجوان مردوں کے لئے مخصوص ہے لڑکیاں سرِ عام اس کھیل میں حصہ نہیں لیتیں۔بعض کھیلیں نوجوان عورتیں ہی کھیلتی ہیں۔ذیل میں ہزارے میں بعض کھیلوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

اونچلے

یہ کھیل لڑکوں کی ہے۔ایک لڑکا گیند کو ہوا میں اچھالتا ہے اور خود ہی اسے روکتا ہے۔پکڑنے کے بعد وہ جسے چاہتا ہے مارتا ہے۔جس کو گیند لگ جائے وہ ضائع ہو جاتا ہے۔اور دوبارہ وہ یہی عمل دہراتا ہے اور دوسرے لڑکے اس کی گیند سے اپنے آپ کو

بچاتے ہیں۔

اپی کڑی

یہ نوعمر بچیوں کی کھیل ہے۔لڑکیاں اس جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی ساتھیوں سے باتیں کرتی ہیں۔ایک لڑکی آنکھیں بند کر کے جھوٹ موٹ کا روتی ہے۔دوسری لڑکیاں اس پر کورس کی شکل میں اس پر ایک مخصوص فقرہ کستی ہیں:

"ہک سہیلی بیٹھی روندی ہے
اس دا ساتھی کوئی پی نیئں
اٹھ سہیلی منہ ہتھ تھو
اسی پھل چن بیچ آئے آں
اپڑی سہیلی کو کہتا ئے آں"

اس طرح باری باری یہ عمل دہرایا جاتا ہے اور بور ہونے تک کھیل جاری رہتا ہے۔

کوڑا چھپاکڑیں

کچھ لڑکے یا لڑکیاں گول دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ایک کپڑے کا کوڑا بنا کر ان کے پیچھے چکر لگاتا رہتا ہے۔اور یہ آواز لگاتا رہتا ہے:

کوڑا چھپاکڑیں۔جمعرات آئی اِیہ
جیہڑا پچھاد یکھے۔اس دی شامت آئی اِیہ

اچانک وہ کوڑا کسی ایک کے پیچھے چھپا دیتا ہے۔اگر کسی کو پتہ نہ چلے تو وہی اٹھا کر اسے مارتا ہے۔اور اگر پتا چل جائے تو دوسرے کو باری مل جاتی ہے۔

غلیل بازی

پرندوں کے شکار اور نشانہ بازی کے لئے بائیسائیکل یا موٹر سائیکل کی ٹیوب کے ربڑ اور کسی مضبوط لکڑی کی دو شاخی لغر کو کاٹ کر بنائی گئی غلیل نوجوانوں میں خاصی مقبول ہے......دیہاتوں میں ایسے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ مل جاتے ہیں جنہیں نہ صرف شکار کیا جاتا ہے بلکہ انہیں حلال کر کے ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے......اس لئے یہ کھیل ہزارہ کے دیہاتوں میں کافی مقبول ہے تاہم بزرگ اور سمجھدار لوگ بچوں کو اکثر اس بات سے منع کرتے ہیں کہ وہ ناسمجھی میں بعض نایاب اور مفید پرندے بھی شکار کرتے ہیں یا ان کی جان سے کھیلتے ہیں۔

پینگ جھوٹواں

یہ بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کی کھیل ہے۔ کسی اونچے درخت کی مضبوط شاخ پر رسی باندھ کر پینگ بنائی جاتی ہے......جدید دور میں بڑے شہروں کے پارکوں اور امیر گھروں کے اندر بھی لوگوں نے جھولے لگا لئے ہیں......لیکن اس کا جو لطف کسی گاؤں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں سہیلیوں سکھیوں کے ساتھ پینگ جھولانے میں آتا ہے وہ کسی شہر کے پارک میں آہنی جھولے پر کہاں میسر ہے۔ عید کے تہوار کے موقع پر پینگ (جھولا) باندھ کر نوخیز بچیاں اور نوجوان لڑکیاں خاص طور پر اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔

گتکہ بازی

ہزارہ کا یہ ایک مقبول کھیل ہے۔ اس کھیل میں دو نوجوان ایک مخصوص قسم کی چھڑی یا تلوار ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں اور اپنی عملی مہارت کا

مظاہرہ کرتے ہیں۔اس کھیل میں مدِ مقابل پر وار کرنے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے انتہائی مہارت، پھرتی، تیزی اور چستی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔قدیم دور میں بھالوں، برچھیوں اور تلواروں سے لڑنے کی تربیت اسی انداز میں دی جاتی تھی ......اب یہ جنگ و جدل کے بجائے تفریح کا ایک کھیل بن چکا ہے اور ہزارہ میں بہت مقبول ہے۔

باندرکلا

اس کھیل میں تین چار یا زیادہ لڑکے حصہ لے سکتے ہیں۔کسی درخت یا کھونٹے سے ایک رسی باندھی جاتی ہے......جس کا دوسرا سرا ایک لڑکا پکڑ کر درخت یا کھونٹے کے گرد چکر کاٹتا ہے۔اس لڑکے کو باندر(بندر) کہا جاتا ہے......بچے اپنی جوتیاں اور اپنے فالتو کپڑے مثلاً قمیض، بنیان، سویٹر وغیرہ کو اس درخت یا کھونٹے نزدیک رکھ رکھ دیتے ہیں......اور ایک کپڑے یا رسی کو کھونٹے یا درخت کے ساتھ اس طرح باندھ دیتے ہیں کہ اس کا سرا پکڑ کر درخت یا کھونٹے کے اردگرد آسانی سے چکر لگایا جاسکے۔اب باندر ان کے چوگرد گول چکر کاٹتا ہے...... باقی لڑکوں نے وہ جوتے یا کپڑے اٹھانے ہوتے ہیں......جنہیں اٹھاتے ہوئے جس لڑکے کو باندر چھولے...... وہ دوبارہ باندر بن جاتا ہے۔دیہات کے بچوں کا یہ ایک مقبول کھیل ہے۔

بوری دوڑ

بچے الگ الگ بوریوں میں اپنے دونوں پاؤں ڈال کر بوری کا منہ اوپر سے پکڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں......اب انہیں ایک دو تین پر اس کھیل کو شروع کرنا ہوتا ہے اور جمپ کرتے ہوئے مقررہ فاصلہ طے کرنا ہوتا ہے......جو سب سے پہلے مقررہ نشان تک پہنچ جائے وہ جیت جاتا ہے۔خاصا دلچسپ کھیل ہے خاص طور پر جب بوری میں

ٹانگیں پھنسا کر جمپ لیتے ہوئے بچے گرتے ہیں تو بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔

یسو پنجو

اس کھیل میں پانچ کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ ہر ایک اپنے لئے ''یسو، پنجو، ہار، کبوتر، ڈولی'' میں سے ایک ایک نام چن لیتا ہے۔ اب تمام کھلاڑی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں (جن کی تعداد ان کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے) کھول کر زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ اب ان میں سے ایک کھلاڑی ان انگلیوں کو ''یسو پنجو......'' کی ترتیب سے گنتا ہے......مثلاً پہلے کھلاڑی نے دو انگلیاں پھیلائیں ہیں، دوسرے نے تین، تیسرے نے دو، چوتھے نے چار اور پانچویں نے ایک تو ان کی کل تعداد بارہ بنتی ہے......ان کی گنتی اگر ''یسو پنجو......'' کی ترتیب سے کی جائے تو یہ ''پنجو'' پر ختم ہوگی......یوں ''پنجو'' لفظ چننے والا پگ جائے گا۔ یہ کھیل نوعمر بچیوں اور بچوں میں یکساں طور پر مقبول ہے......بعض دفعہ گھر میں بہن بھائی بھی مل کر کھیلتے رہتے ہیں۔

کوڈی (کبڈی)

کھیل شروع کرنے کے لئے کھلے میدان میں مخصوص لمبائی کی ایک لکیر کھینچ کر اس کے دونوں سروں پر نشان لگا دیتے ہیں یا کچھ بندے کھڑے کر دیتے ہیں۔ ان سروں کو پاسے یا بُتی کہا جاتا ہے۔ اس کھیل کی کئی صورتیں ہیں:

بڑ کوڈی یا سادوالی کوڈی: دونوں اطراف کے کھلاڑی اپنی اپنی حدود میں پھیل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف سے ایک جوان ''ساہ'' ڈالتا ہے۔ وہ کوڈی کوڈی کہتا ہوا دوسری طرف کی ٹولی کے کسی کھلاڑی کو ہاتھ لگانا چاہتا ہے جبکہ دوسری

طرف کی ٹولی کا ہر کھلاڑی اپنے آپ کو بچا تا ہے اور ساتھ ہی اس کے گرد گھیرا تنگ کرتا ہے تا کہ اسے پکڑ سکے، اس جدوجہد میں اگر سانس اکھڑ جائے تو وہ کھلاڑی مر (ہار) جاتا ہے اور اگر وہ کسی کھلاڑی کو ہاتھ لگا کر بھاگ جائے تو جیت جاتا ہے۔

چھل کوڈی: اس میں سانس روکنے کی قید نہیں...... یعنی کوڈی کوڈی کہنا ضروری نہیں ہوتا...... بلکہ لکیر کے دوسرے جانب جا کر کسی ایک کھلاڑی کو چھو کر بھاگ آنا ہوتا ہے...... دوسری طرف کے کھلاڑیوں میں سے جسے ہاتھ چھو جائے اب اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کھلاڑی کو اپنی حدود سے باہر نہ جانے دے اور بزور پکڑ کر بے بس کردے۔

چیرویں کوڈی: اس کوڈی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف سے ایک ایک کھلاڑی آمنے سامنے آ کر مقابلہ کرتے ہیں...... ایک نے روکنا ہوتا ہے اور دوسرے نے بھاگنا ہوتا ہے...... یہاں ہر ٹیم کے ہر ممبر کو انفرادی طور پر زور آزمائی کا موقع دیا جاتا ہے۔

آرا

یہ کھیل بچیوں اور نوعمر لڑکوں دونوں کے لئے ہے۔ دو لوگ مخالف ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اوپر نیچے پکڑتے ہیں جو کراس کی شکل میں بن جاتا ہے۔ تیسرا ان ہاتھوں کے اوپر سے چھلانگ لگاتا ہے۔ اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ ہاتھوں کو مس کر جائے تو ہار جاتا ہے۔

گھٹی

اس کھیل میں تین لوگ شریک ہوتے ہیں۔ دو اوپر نیچے چارپائی کو پکڑتے

ہیں تیسرا اس کے اوپر سے چھلانگ لگاتا ہے۔ اگر وہ ٹکرا جاتا ہے تو ہار جاتا ہے۔ باری باری سب یہی عمل دہراتے ہیں۔

ٹکا پری جانا

یہ بچیوں کا کھیل ہے۔ دو آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسری کو دیکھتی رہتی ہیں اور تیسری ان کے نام لکھتی ہے اور ساتھ ہی یہ الفاظ دہراتی ہے:

ٹکا پری جانا۔ شور نہ مچانا
نیلی پری تھپڑ مار کے جانا
پیچھے مڑ کے تاڑی بجانا

راجہ......رانی

یہ نوعمر لڑکیوں اور لڑکوں کا کھیل ہے۔ چاہے جتنے بھی حصہ لینے والے ہوں سب ایک دائرہ کی شکل میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہے ایک (رانی) ان کے درمیان کھڑی یا کھڑا ہو جاتا ہے۔ درمیان والا وہ گھیرا توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے وہ بھاگ جائے وہ اندر مقید ہو جاتا ہے اور بھاگنے والا دائرہ بنانے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

چور سپاہی

اس کھیل میں کل چار رکن ہوتے ہیں چار پرچیوں پر ہزار، پانچ سو، ایک سو اور صفر لکھا جاتا ہے۔ ہزار نمبر کی پرچی جس کے ہاتھ آئے وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ پانچ سو والا وزیر اور ایک سو والا سپاہی کہلاتا ہے۔ جس کے پاس صفر والی پرچی آئے وہ چور ہوتا ہے۔ کھیل کے شروع میں بادشاہ وزیر سے پوچھتا ہے کہ چور کون ہے؟ اگر وزیر چور نہ بتا سکے

تو اسے صفر نمبر ملتے ہیں اور باقی لوگ جیت جاتے ہیں اور اگر وزیر صحیح اندازہ لگا کر بتا دے تو کھیل دوبارہ شروع ہوتا ہے۔

چھمی لائڑاں

اس کھیل میں گہرے پانی میں نہاتے ہوئے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک زیرِ آب رکھنے اور سانس روکنے کی مشق کی جاتی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ لڑکے اس کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں زیرِ آب ڈبکی لگاتے ہیں اور پھر جتنی دیر سانس روک سکتے ہیں زیرِ آب رہتے ہیں۔ سب سے پہلے سطحِ آب پر آنے والا ہار جاتا ہے۔ بعض شرارتی اور تیز طبع لڑکے پہلی ڈبکی ختم ہونے پر آنکھ بچا کر دوبارہ زیرِ آب چلے جاتے ہیں۔

نیزہ بازی

یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں جواں مردوں کو اپنی تیزی و طراری اور پھرتی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے...... کسی کھلے اور وسیع میدان میں تین تین چار چار کی ٹولیوں میں گھڑ سوار اپنے اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ہاتھ میں نیزہ لے کر گھوڑے کو پوری رفتار سے ایک سیدھ میں دوڑاتے ہیں اور نیزے کی انّی سے میدان میں ایک مخصوص مقام پر گاڑے گئے کھونٹے کو اکھاڑتے ہیں...... اس کھیل میں نہ صرف گھڑ سوار اپنی مہارت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ گھوڑے بھی اپنی تیزی و طراری سے دیکھنے والوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ یہ کھیل میلوں ٹھیلوں یا تفریحی مقابلوں کے دوران کھیلا جاتا ہے اور ہزارہ کے کچھ علاقوں میں نہایت مقبول ہے۔

باب نہم

ہزارہ کے کھیت کھلیان

ہزارہ کی بیشتر آبادی کا انحصار کاشت کاری پر ہے۔ کسان محنت سے دھرتی کا سینہ چیر کر کاشت کرتا اور اپنی نگاہیں آسمان پر جمائے رکھتا ہے کیونکہ نہریں اور ٹیوب ویل عنقا ہیں اور زیادہ تر علاقہ بارانی ہے البتہ کچھ بالائی علاقے ایسے بھی ہیں جنہیں پہاڑی چشموں اور دریاؤں کا وافر پانی میسر ہے۔ لیکن ان علاقوں کی قابلِ کاشت زمین کی سطح کی ناہمواری بعض اوقات زمین کی مکمل اور بھرپور سیرابی میں آڑے آتی ہے۔ یہاں کا کاشتکار میدانی علاقوں کے کاشتکار سے زیادہ محنتی، جفاکش اور مشکل پسند ہے۔ اس علاقے کا کاشتکار بھی صبح دم خوش الحان پرندوں کی چہکار کے ساتھ بستر چھوڑ دیتا ہے اور اپنے روزمرہ کے معمولات میں جت جاتا ہے۔ خواتین بھی اذانِ سحر کے ساتھ بیدار ہو جاتی ہیں، گھر میں جھاڑو پوچا کرنے کے بعد چولہا چوکا سنبھال لیتی ہیں۔ مرد جب کھیتوں میں چلے جاتے ہیں تو عورتیں ہی گائے بھینسوں کے تھان صاف کرتی ہیں اور اُپلے تھاپتی ہیں۔ اس طرح گھر کے کام کاج میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اب تنور کی پکی سوندھی سوندھی خوشبو والی گندمی روٹی مکھن، لسی اور حسبِ توفیق سالن بھی لے کر کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں کا لنچ لے کر پہنچ جاتی ہیں۔

سال میں دو فصلیں اٹھائی جاتی ہیں، جن میں گندم، باجرا، مکئی، چاول اور دالیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ ہر چند کہ نئی نسل کے دیہاتی بچے اور بچیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں لیکن فصل کی کٹائی کے موسم میں سکولوں میں عموماً ان کی حاضری بھی کم رہتی

ہے۔

کٹائی کا موسم انتہائی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ ہر ایک چھوٹا ہو یا بڑا دن بھر اپنے کھیتوں میں ہی گزارتا ہے۔ کٹائی کے ایام میں ہمسایوں اور عزیز رشتہ داروں سے مدد لی جاتی ہے۔ اس موقع پر خصوصی کھانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات حلوہ بطور اضافی سویٹ ڈش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب فصل زیادہ ہو اور فصل کاٹنے والے لوگ بھی قدرے زیادہ ہوں تو شغل میلے کے لئے ڈھول ڈھمکے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ لوگ نچاتے گاتے بھنگڑا ڈالتے ہوئے آتے ہیں اور کٹائی میں جت جاتے ہیں۔

فصل جب کٹ کر کھلیان میں پہنچ جاتی ہے تو دوبارہ بیرونی مدد یعنی ہمسایوں یا رشتہ داروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیہات کے لوک جتنے دشمنی اور نفرت کے معاملے میں سخت دل واقع ہوئے ہیں اتنے ہی باہمی اخلاص میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ فصل جب بوریوں میں بھر کر گھر پہنچتی ہے تو سال بھر کی ضرورت کے مطابق غلہ وغیرہ گھر میں ذخیرہ کرلیا جاتا ہے اور ضرورت سے وافر مقامی منڈیوں میں بیچ دیا جاتا ہے۔

ماخذ کتب ورسائل

(اس کتاب کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب و رسائل سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے جس کے لئے مصنف تمام مصنفین، مولفین، مرتبین اور مترجمین کا سپاس گزار ہے)

۱۔ ابوظفر ندوی، تاریخ سندھ، ندوۃ المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۶۶ہجری

۲۔ ابوالفضل العلامی، آئینِ اکبری، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۲ء

۳۔ استاد بہرام فیروز کرمانی: فہرست مخطوطات خطی در علم وفن موسیقی، استنبول (ترکی)، سن ندارد

۴۔ البیرونی، کتاب الھند، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۷۷ہجری

۵۔ امپیریل گزیٹر آف انڈیا...... پراونشل سیریز پنجاب (جلد دوم)

۶۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر، ادبیات ہزارہ، ایبٹ آباد جنوری ۲۰۰۹ء

۷۔ پرواز تربیلوی، پھل تے کنڈے، ہندکو ادبی جرگہ، ایبٹ آباد ۱۹۸۴ء

۸۔ پرواز تربیلوی، کھکھرتے لگّھن، ہندکو ادبی جرگہ (ہزارہ ڈویژن)، ایبٹ آباد ۲۰۰۰ء

۹۔ تاریخ ادبیاتِ پاک و ہند، جامعہ پنجاب، لاہور، جلد۲

۱۰۔ چہار مقالہ (تحقیق ڈاکٹر معین الرحمٰن)، تہران (تیسرا ایڈیشن)

۱۱۔ حامد محمود (مدیر) تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جامعہ پنجاب، لاہور، جلد۲

۱۲۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۴۱ء

۱۳۔ حیدر زمان حیدر، مشال، ہندکو ادبی جرگہ (ہزارہ ڈویژن)، ایبٹ آباد ۱۹۹۵ء

۱۴۔ حیدر زمان حیدر، ہندکو چار بیتے دے رنگو رنگ مدارے، مصطفائی پریس، باغ جناح، ایبٹ آباد ۱۹۸۰ء

۱۵۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء

۱۶۔ رشید احمد ندوی، مغربی پاکستان کی تاریخ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۷۔ زبیر احمد، عربی ادب میں برصغیر کا حصہ، شیخ محمد اشرف، لاہور، س ن

۱۸۔ سید سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات، ہندوستانی اکادمی، احمد آباد ۱۹۳۰ء

۱۹۔ سیّد جعفر، اوپرے گوشے، ہند کا ادبی سنگت، ایبٹ آباد ۱۹۹۸ء

۲۰۔ شیر بہادر خان پنّی، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، مکتبہ جمال، اردو بازار لاہور ۲۰۱۰ء (طبع دوم)

۲۱۔ عبدالحئی رائے بریلوی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، ۱۹۵۶ء

۲۲۔ عبدالحئی رائے بریلوی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، نور محمد تاجران کتب، کراچی، ۱۹۷۶ء
جلد ۱

۲۳۔ عبدالغفور ملک، روپ سروپ، مصطفائی پریس، باغ جناح ایبٹ آباد ۱۹۹۸ء

۲۴۔ علی اصغر، پارسی نغز، مطبع نامی پریس، لاہور س ن مدارد

۲۵۔ علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، چچ نامہ (فتح نامہ سندھ) ادارہ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد ۱۹۸۳ء

۲۶۔ غلام سرور لاہوری، مفتی، تاریخ مخزن پنجاب، لاہور، ۱۸۸۷ء

۲۷۔ فخر الدین محمد، ڈاکٹر: ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ، اسٹیم پریس ایسٹ بنگال،
۱۹۴۶ء

۲۸۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول، دوم

۲۹۔ لی بان، تمدن عرب (ترجمہ سید علی بلگرامی)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء

۳۰۔ محمد اسحاق، ڈاکٹر، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء

۳۱۔ محمد رمضان علوی، ڈاکٹر، ہندوستان کے علماء کی عربی تصنیفات (انگریزی)، ڈھاکہ یونیورسٹی،
ڈھاکہ، س ن

۳۲۔ مولوی ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مکتبہ خاور لاہور، ۱۹۷۹ء

۳۳۔ ناصر بخت یار خان، قاضی، پچھلے پچ پھل، مثال پبلشرز، امین پور، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء

۳۴۔ ہفت روزہ ”آغاز“ لاہور، شمارہ ۲: جلد ۱، بابت مارچ ۱۹۶۱ء

۲۷ ستمبر ۲۰۱۲ عیسوی

ثقافتِ ہزارہ اور اس کا تہذیبی پس منظر

محمد بشیر رانجھا



سیّد سخاوت شاہ

وائس چانسلر - ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ



پروفیسر بشیر احمد سوزؔ

مصنف کی دیگر کتب



- سیرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ (سوانح) (مطبوعہ)
- نظریاتِ اقبال (نقد و نظر) (مطبوعہ)
- پُل صراط (اردو افسانے) (مطبوعہ)
- سرِ شاخ (اردو شاعری) (مطبوعہ)
- دِل کتنا سادہ ہے (اردو ماہیا) (مطبوعہ)
- انسائیکلوپیڈیا اہلِ قلم (زیرِ طبع)
- تحسین و آفرین (نقد و نظر) (زیرِ طبع)
- معروض (انتخاب مجلّہ شعر و سخن) (زیرِ طبع)

مکتبہ جمال

MAKTABA JAMAL

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Cell: 0300-8834610/ Ph: 042-37232731

mjamal09@gmail.com/maktabajamal@yahoo.co.uk

Design By: 0300-4529821 MUHAMMAD AHSUN GULL